ایک ایسا بھی دَور

(کورونا کی ڈائری، وہ سات دن اور چند افسانچے)

سائی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

263236

ایک ایسا بھی دور

(کورونا کی ڈائری، وہ سات دن اور چند افسانچے)

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

نعیمہ جعفری پاشا
25.5.22

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

© ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

نام کتاب : ایک ایسا بھی دور
(کورونا کی ڈائری وہ سات دن، اور چند افسانچے)
مصنف : ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا
پتہ : 141۔ گراؤنڈ فلور، پاکٹ 2، جسولہ، نئی دہلی
رابطہ : 9911802189
کمپوزر : محمد نوشاد عالم، 9015763829
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
سرورق : ٹیم عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Ek Aisa bhi Daur
(Corona ki Dairy, Woh Saat Din aur Chand Afsanche)
by Dr. Naim Jafari Pasha
Edition : 2022 Price : Rs. 250
ISBN : 978-93-93998-42-2

ملنے کے پتے
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6 — 011-23260668
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی — 011-23276526
- رائعی بک ڈپو، 734 اولڈ کٹرہ، الٰہ آباد — +91 7905454042
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ — +91 9358251117
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4 — +91 9304888739
- کتاب دار، ممبئی — +91 9869321477
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد — +91 9325203227
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر — +91 9797352280

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +919971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

فہرست

سخن معتبر

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا سادات کے ایک ایسے ممتاز و مقتدر خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں جو علمی اور ادبی اقدار کا علم بردار و پاسدار رہا ہے۔ نعیمہ صاحبہ نثر و نظم ہی میں نہیں بلکہ اردو اور ہندی میں بھی لکھتی ہیں۔ ان دونوں زبانوں میں ان کی کئی کتابیں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں اور قارئین سے داد و تحسین پا چکی ہیں۔

زیر نظر کتاب ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے افسانچوں اور ڈائری کے صفحات پر مشتمل ہے۔ ''وہ سات دن'' دراصل موصوفہ کی اس مختصر سی ڈائری کے صفحات ہیں۔ چار مئی سے دس مئی 2021ء تک یہ سات دن انہوں نے کورونا کی عالم گیر وبا کے دوران ایک مریضہ کی حیثیت سے آکسیجن ماسک کے اندر نفس کی آمد و رفت پر ذہن کو مرکوز کرتے ہوئے گزارے۔ یہ تجربہ زیست و مرگ کے درمیان اپنے عزیز و اقارب کے اپنی دنیا کے حیات و مرگ کے اور خود اپنے بارے میں ذہن میں آنے والے خیالات کو فنکارانہ انداز میں پیش کر دینے کا ایک غیر معمولی تجربہ ہے جو ممتاز شیریں کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

نعیمہ جعفری ناول نگار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ وہ ان دونوں اصناف کے

حدود سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے افسانچے منٹو کے سیاہ حاشیے والے افسانچوں سے مختلف اور منفرد ہیں۔ ان افسانچوں کے پیر چادر سے باہر نکلتے نظر آتے ہیں اور یہ مختصر ترین مختصر افسانوں سے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو ادب کے قارئین ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی دوسری تصانیف کی طرح اس کتاب کو بھی دلچسپی سے پڑھیں گے اور پسند کریں گے۔

پروفیسر صادق

نئی دہلی۔25

اظہار خیال

2020ء کے اوائل سے ہی ملک میں کورونا کی وبا کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا۔ چین سے نکلنے والی یہ وبا دنیا کے متعدد مما لک میں پھیل چکی تھی اور یوروپ کے بعد تیسری دنیا کے مما لک بھی رفتہ رفتہ اس کی چپیٹ میں آتے جارہے تھے، جن میں وطن عزیز بھی شامل تھا۔ مارچ کے وسط تک پورے ملک اور شہر دہلی میں کورونا کا جسے کووڈ ۱۹ ر کا نام دیا گیا تھا، خوف پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ لاک ڈاؤن کے اعلان کے بعد تو کورونا نے ایک ہوّے کی طرح ذہنوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ کسی کو چھینک بھی آجاتی تو شبہ ہوتا کہ اسے کورونا نہ ہو گیا ہو۔ احتیاطی تدابیر کی جو فہرستیں نشر ہورہی تھیں، ان پر عمل جن گھروں میں مبالغے کے ساتھ کیا جارہا تھا، ان میں ہمارا گھر بھی تھا۔ گھر سے نکلنا تو دور کی بات ہے، ہم لوگ تو اپنی بالکونی میں بھی جانے سے گریز کررہے تھے۔ ہر قسم کے سینی ٹائزر اور ماسک کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع تھا۔ ہاتھ دھودھو کر کھال اتری جارہی تھی۔ بازار سے جو بھی سامان آتا، تین دن تک پارکنگ میں رکھا رہتا چوتھے دن Senitize کرنے کے بعد گھر میں لایا جاتا۔ نوکرانیوں اور ڈرائیوروں کی چھٹی کردی گئی تھی صرف ہوم ڈلیوری پر گزارا ہورہا تھا، دل

کو اطمینان سا تھا کہ ہمارے گھر میں کورونا کا گزر نہیں ہوگا انشاء اللہ۔

یہ خیال عام تھا کہ 2020ء میں دو 20 کا جمع ہونا منحوس ہے۔ سال گزر جائے تو بلا، وبا اور بیماری جو بھی ہے ٹل جائے گی۔

2020ء کا پورا سال گزرا۔ بیماریاں بھی آئیں اور سانحات بھی ہوئے۔ میرے شوہر چالیس سال کا ساتھ چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، خاندان میں اور بھی صدمات ہوئے لیکن کورونا سے کوئی نہیں گیا۔ سال ختم ہوا۔ 2021ء کی آمد نے نئی امیدیں جگائیں لیکن بڑی جلدی سارے بھرم ٹوٹ گئے۔ ہم جو اپنے خاندان کو کووِڈ پروف سمجھ رہے تھے، وہ یقین خواب وخیال بن گیا۔ پہلے بیٹی، داماد اور نواسا نواسی کو انفیکشن لگا۔ لیکن وہ لوگ حضرت نظام الدین میں تھے، ہمارا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ لیکن پھر چھوٹے بیٹے کو بخار ہوا تو اس نے اپنے آپ کو بیس منٹ میں اپنے کمرے میں مقید کرلیا۔ میں نے سات دن اس کی شکل بھی نہیں دیکھی لیکن ہونی کو کون ٹال سکا ہے۔

26 اپریل، گیارہویں روزے کی صبح حسب معمول میں سحری میں اٹھی تو طبیعت بھاری سی لگی ہلکا سا سر میں درد اور ناک بند، کوئی خاص بات نہیں، کبھی کبھی اے سی (AC) میں سونے سے بھی ہو جاتا ہے۔ سحری کھائی تو کسی چیز میں ذائقہ نہیں آیا۔ رات کو یہی کھانا خاصا ذائقہ دار تھا۔ چائے بھی عجب بے مزہ سی لگی۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ سحری کا وقت ختم ہو رہا تھا لیکن دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ دن بدستور رہا۔ کھایا نہیں تو ذائقے کے ختم ہونے کی توثیق بھی نہیں ہوئی۔ کسی سے کچھ کہا نہیں، بچے میرے روزہ رکھنے کے سخت خلاف تھے۔

اینجیو گرافی (پلاسٹی) کو ابھی مہینہ بھر ہوا تھا۔ جب افطار میں بھی مزہ نہیں آیا تو میں نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کرلیا۔ رات کو بخار تیز ہو گیا۔ صبح سے سانس

لینے میں دقت ہونے لگی۔ کورونا کے ٹیسٹ کے لیے ہوم کلیکشن (Home Collection) والے کو بلالیا۔ لیکن تکلیفوں نے رپورٹ کا انتظار نہیں کیا۔ ڈاکٹر سے آن لائن بات کر کے دوائیں شروع کردی گئیں۔ بیٹوں نے Oxygen Concentrater خرید لیا۔ اس سے کام نہیں چلا تو آکسیجن کا سلنڈر بھی منگوالیا۔ چھوٹے بیٹے نے اب احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھی وہ دن رات میری دیکھ بھال میں لگا رہا۔ رپورٹ پازیٹو آ گئی۔ کورونا کا علاج شروع ہو گیا، لیکن حالت بگڑتی ہی گئی، بخار اور تیز ہو گیا۔ سانس اور بگڑ گئی تو ڈاکٹر نے اسپتال میں داخل کروانے کی تاکید کی۔

میں کسی طور اسپتال میں داخل ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ چاہتی تھی کہ گھر میں ہی موت آ جائے۔ کم سے کم میت کی وہ بے حرمتی تو نہ ہو جو میں ہر دن سن رہی تھی۔ اس کے علاوہ پچھلے ایک سال سے اسپتالوں کی جو حالت صحت یاب ہو کر آنے والوں نے بتائی تھی، اس کے تصور نے بیماری کی شدت کو اور بڑھا دیا تھا۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ ایک بار داخل ہونے کے بعد گھر والوں کو نہ کوئی خیر خبر رہتی ہے اور نہ مریض سے رابطہ ہو سکتا ہے، کیونکہ موبائیل بھی نہیں دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی لاپروائی، اور پیرا میڈیکل اسٹاف کی سنگ دلی، غیر صحت مند ماحول، دواؤں اور آکسیجن کی عدم دستیابی، بے حد خراب، ٹھنڈا کھانا، وقت بے وقت دیا جانا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب حالت زیادہ بگڑی اور ڈاکٹر نے کہا کہ گھر پر علاج ممکن نہیں ہے تو بچوں نے میری ایک نہ سنی اور چار مئی کو مجھے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

سات دن اسپتال کے دورانِ قیام کے واقعات میں نے اپنی کورونا کی اس ڈائری میں رقم کیے ہیں جو آپ کے پیش نظر ہیں۔

اپنے تینوں بچوں کے لیے میرے دل اور لبوں پر دعائیں ہی دعائیں ہیں کہ

ایسے وقت میں جب اسپتالوں میں بیڈ عنقا تھے، آکسیجن کالا بازاری کے باوجود، مہیا نہیں تھی۔ اسپتالوں اور ڈاکٹروں کی لاپروائیوں کے قصے عام تھے۔ لوگ اپنے متعلقین کو دور دراز علاقوں کے اسپتالوں میں اور اکثر دوسرے نزدیکی شہروں کے اسپتالوں میں داخلے کے لیے پریشان گھوم رہے تھے، انھوں نے نہ جانے کن مشکلوں سے میرے لیے ایک ایسے اسپتال میں داخلے کا انتظام کیا جس سے بہتر شاید کوئی اسپتال نہ ہو اور جس نے میرے دل سے اسپتالوں کے خوف کو دور کر دیا۔ ہر سہولت وہاں مجھے میسر آئی۔ بیماری کی تکلیف اپنی جگہ، لیکن بہترین دیکھ بھال اور عمدہ علاج ہوا۔ پیرامیڈیکل اسٹاف کی خدمات کے لیے تو میرے پاس تشکر کے الفاظ نہیں ہیں۔ ایک آواز (گھنٹی) پر فوراً موجود۔ ایک ایسے ماحول میں جب اپنے قریب ترین لوگ بھی قریب آنے سے گھبراتے ہیں، یہ لڑکیاں مجھے سہارا دیتی تھیں ہاتھ تھام کر واش روم لے جاتی تھیں، جب ناامیدی اور تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسو آتے تھے تو میری پیٹھ تھپتھپا کر مجھے تسلی دیتیں اور ہر آدھے گھنٹے پر میری خیر خبر لینے چکر لگاتی رہتی تھیں۔ کھانا اچھا اور بروقت، صفائی شاندار۔

میں بیماری سے لڑ رہی تھی، لیکن دیکھ بھال جیسی تھی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی اور یہ اطمینان بھی تھا کہ گھر سے دور رہنے کی وجہ سے میرے بچے اور پوتا پوتی مجھ سے انفیکشن لگنے کے خطرے سے محفوظ ہیں۔

ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے دوستوں کے خلوص اور دعاؤں کا اعتراف نہ کروں۔ میری قریبی دوستیں، میرے کرم فرما حضرات اور ان گنت سوشل میڈیا کے وہ دوست جنھوں نے صرف میری تحریریں پڑھی تھیں اور جن سے رابطہ صرف برقی لہروں کے ذریعہ تھا، فکر مند تھے اور اپنی دعاؤں میں مجھے شامل کر رہے تھے۔

بہت سے لوگ کہا کرتے تھے کہ کورونا کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک سیاسی ہتھکنڈا ہے، بین الاقوامی تعلقات کو متاثر کرنے کا یا اقوام عالم پر اپنی عظمت اور انانیت ثابت کرنے کا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کچھ نہیں موسمی بخار ہے جسے مفاد پرست ہوّا بنا رہے ہیں۔ لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ کوئی معمولی بیماری نہیں ہے۔ اس میں مبتلا ہونا اور اس سے نبرد آزما ہونا میری زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ اور depressing تجربہ تھا، اللہ سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

الحمدللہ میں زندہ سلامت ہوں اور اپنے گھر اپنوں کے ساتھ ہوں۔

''وہ سات دن''

4 مئی تا 10 مئی

2021

''کورونا اسپتال کی ڈائری''

اسپتال کے بستر پر، آکسیجن کے
ماسک کے اندر سانسوں کی ڈوری کو
تھامتے ہوئے کچھ جلتی، بجھتی یادیں''

نعیمہ جعفری پاشا

”وہ کیا تھا؟؟؟“

یہ افسانہ نہیں تھا، افسانچہ بھی نہیں تھا، انشائیہ بھی نہیں تھا، سرگزشت بھی نہیں تھی، رپورتاژ بھی نہیں تھا، یاد بھی نہیں، تصور بھی نہیں، میرا تخیل بھی نہیں، کوئی علامت نہیں، کوئی استعارہ نہیں، کیونکہ میرے ذہن کے سوتے بند تھے۔ یہ الفاظ، یہ نام، اس وقت میرے شعور، تحت الشعور یا لاشعور کی سطح پر کہیں نہیں تھے۔

لیکن.......... ہاں کچھ تھا، کچھ تھا، کچھ تو ضرور تھا، تھا تو ضرور.................. وہ کیا تھا؟؟؟

”شکستہ ذہن کی

شکستہ تحریریں“

”پہلا دن، پہلی رات“

جب میں یہاں لائی گئی تو میں ہوش اور بے ہوشی، حواس اور بے حواسی کی خندقوں کے درمیان جھول رہی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ دن تھا یا رات تھی، کیا روز تھا، کیا تاریخ تھی، کیا وقت تھا، دو مددگاروں نے مجھے بازوؤں سے تھام رکھا تھا، میں گھسٹ رہی تھی۔ میرا ہر قدم ایک گہری کھائی میں اپنا سہارا تلاش کر رہا تھا۔ مجھے بیڈ پر بچھا دیا گیا۔ میرے سر میں درد کے دھماکے ہو رہے تھے، میرا چہرہ جل رہا تھا، میری سانس تھی یا نہیں تھی یا حد سے گزر چکی تھی، اکھڑی اکھڑی، ٹوٹی ٹوٹی، چہرہ آکسیجن ماسک سے ڈھکا ہوا تھا، پھر شروع ہوئی وجود کی جنگ، وہ جنگ جو شاید میں نہیں لڑ رہی تھی، جو میرے لیے لڑی جا رہی تھی۔ انجکشنوں کی بوچھار، سوئیوں کی چبھن، ٹیسیں، وہ تکلیفیں جو بہت چھوٹی تھیں، جن کے احساس سے میں گزر چکی تھی۔

لڑنے والے ہاتھ بھی میرے نہیں تھے۔ یہ جنگ تھی ڈاکٹروں کی، یہ جنگ تھی پیرامیڈیکل اسٹاف کی، یہ جنگ تھی میرے بچوں کی اشک آلود نگاہوں کی، یہ جنگ تھی ان کی خاموش صداؤں کی، یہ جنگ تھی میرے اپنوں کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی جن کی دعائیں کہیں بہت بلندی تک پہنچ رہی تھیں، یہ جنگ تھی ان پریشان، فکرمند چہروں پر

ابھرنے والی لکیروں کی، جنھیں میں نے کبھی دیکھا نہیں، جانا نہیں لیکن جن سے ایک بہت مضبوط رشتہ قائم ہو چکا تھا، زمان و مکان سے پرے، احساس اور خلوص کا رشتہ، اور یہ جنگ تھی ایک چھوٹے سے بے بضاعت جرثومے کے خلاف۔ اس جنگ میں سب میرے لئے لڑ رہے تھے اور میں صرف ایک ہاری ہوئی، ٹوٹی ہوئی سپاہی تھی، لیکن وہ قادر مطلق، وہ خالق کون و مکاں، وہ رحیم و کریم، وہ رحمٰن، وہ غفار، وہ ذات افضل و اعلیٰ، دکھے دل کی کارساز، سننے والی، دیکھنے والی، جاننے والی، ہر شے پہ قادر، وہ ذات نگراں تھی اور ہے۔

پھر غالباً رات ہوئی۔ بہت سخت بہت پر ہول، بہت خوفناک، بہت مایوس کن، جیسے اپنے ساتھ اجل کے کارندوں کو بھی لائی تھی۔ مجھے لگا کہ میرا کمرہ اچانک سمٹ کر ایک خلائی جہاز کے گول ڈبے میں بدل گیا ہو جس میں صرف دو دروازے تھے، ایک جس سے میں اندر آئی تھی اور اب بند ہو چکا تھا، دوسرا میرے سامنے تھا، جس میں قفل پڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گول بند کھڑکیاں، اندھیرا گھپ۔ میں چھٹپٹا رہی تھی۔ اچانک ایک زناٹے کی آواز ہوئی۔ ایک گول کھڑکی کھلی اس کی نیم روشن فضا میں ایک خوفناک سیاہ چہرہ ابھرا، سرخ بال، نارنجی آنکھیں، نوکیلے دانت، چہرے پر شیطانی رقص۔ پھر دو پتلے پتلے ہاتھ کھڑکی سے اندر رینگ آئے، میرے گلے کی طرف بڑھنے لگے لیکن مجھ تک نہیں پہنچے۔ میری چیخیں گلے میں گھٹنے لگیں، چہرہ غائب ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے دوسری کھڑکی کھلی، پھر تیسری، پھر کھڑکیاں کھلتی رہیں، چہرے خوفناک سے خوفناک تر ہوتے گئے۔ سوکھے، لکڑی کی سوکھی ٹیڑھی، تڑی مڑی شاخوں جیسے ہاتھ میرے قریب سے قریب ہوتے گئے۔ آنکھوں کی شیطانی چمک، خون آلود ہونٹوں کی مکروہ مسکراہٹ، سانسوں کا تعفن، میرے چہرے پر منڈرانے لگا، میرے

لیے ہلنے جلنے کی جگہ نہیں رہی۔ سانس تیز درد کی لہر کے ساتھ رک گئی۔ وہ انگلیاں میرے گلے اور سینے تک پہنچ گئیں اور میں بے خبر ہوگئی۔

کتنے، لمحے، کتنی ساعتیں، کتنے دن، کتنے سال، کتنی صدیاں، کچھ خبر نہیں، جو رہی سو بے خبری رہی۔

پھر نہ جانے کب میرے درد آشنا پپوٹوں کو حرکت ہوئی۔ میں نے مشکل سے آنکھیں کھولیں۔

میں تنہا تھی، لیکن میرا کمرہ کشادہ ہوگیا تھا، کھڑکی سے دودھیا سی روشنی پھوٹ رہی تھی، بند دروازے کی جھڑیوں سے شعاعِ امید کے دھاگے جھلملا رہے تھے۔

میں نے اپنے تھکے ہوئے، پسینے میں نہائے ہوئے، ریزہ ریزہ وجود کو مجتمع کر کے پاؤں بیڈ سے نیچے اتارے تو مہربان زمین نے اوپر اٹھ کر میرے قدموں کو تھام لیا۔

دوسرا دن، دوسری رات

کربِ تنہائی

دن جیسے تیسے گزرتا رہا۔ تھکے ہوئے مسافر نے دریچے کی آڑی ترچھی لکیروں سے جھانکا۔

باہر یہ کون چلی آرہی تھی۔

جس کا انتظار تھا۔

نارنگی کناروں سے چمکیلی روشنی ماند پڑنے لگی، سرمئی چھٹاؤں نے زعفرانی لہروں کو نگلنا شروع کر دیا۔

نارنجی اور سرمئی دھندلکوں کو گہرے بھورے دائرے نگل گئے۔

مٹ میلی سیاہ چادر کا شامیانہ تن گیا، لیکن اس میں کوئی لیس نہیں تھی۔

اس میں کامدانی کا بھی کوئی نقش نہیں تھا۔

سیاہ بادلوں پر لگا ہوا چاندنی کا کوئی پیوند بھی نہیں تھا۔

گھر لوٹتے پرندوں کے شور کو اس نے اپنی موٹی چادر کی تہوں میں چھپا لیا تھا۔

شیشے کی دیواروں نے مترنم آوازوں کو قید کرلیا تھا۔وہ، جو اپنے ساتھ شباب اور سرمستی لاتی تھی، وہ آئی

لیکن نہیں آئی

وہ رات تھی۔

جسے چاہو، وہ دور بھاگتا ہے، میں نے رات کو پرے سرکا کر اس کی مہربان سہیلی کی طرف پلکوں کی انگلیوں کو پھیلایا۔

یہ تو بڑی دلکش ہوا کرتی تھی۔

یہ تو بڑی خواب آگیں تھی۔

یہ تو ریگستان کی تپتی ریت پر بارش کی پہلی بوند تھی۔

پھر آج یہ اتنی سہمی سہمی کیوں ہے۔اپنی سکھی کا سیاہ ہولناک آنچل تھامے چہرہ کیوں چھپا رہی ہے!

میں نے تصور کے کانپتے ہاتھوں سے گزشتہ سالگرہوں کی ادھ جلی موم بتیوں کو اکٹھا کیا۔

امید کی ماچس کے جھراٹے کے ساتھ روشنی کے کانپتے شعلے کو ہواؤں سے بچا کر آنکھوں کی بستیوں کو خوابوں سے روشن کرنا چاہا۔

ایک ننھے سے شعلے نے ہتھیلی پر ایک گرم نشان چھوڑ دیا۔

روشنی بجھ گئی۔

ہتھیلی سلگ گئی۔آنکھیں جل اٹھیں۔

آخری موم بتی کی آخری بوند نے بڑا سا چھالا بنا دیا۔

گھڑیاں گزر گئیں

وہ نہیں آئی!

وہ نیند تھی۔

لیکن

پڑوس میں وہ آ گئی!

جس کی دستکوں نے رات بھر دہلائے رکھا تھا۔

جب ساری رات آکسیجن اور مشینوں کی ٹرالیوں نے اسپتال کی آسیب زدہ غلام گردشوں میں کرخت آوازوں کا محشر بپا کر رہا تھا۔

جب سینے کے خشک تاروں سے مدد کی آخری چیخیں خالی دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھیں، جب آنکھوں کے بجھتے دیوں کو کسی مسیحا کا انتظار تھا۔

نیلگوں لفافوں میں ملفوف مسیحا آخری کوششیں کر کے ہار گئے۔

سر جھک گئے۔

ہاتھ نیچے گر گئے۔ وہ موت تھی۔

خاموشی نے اپنے بے رحم پنجے درو دیوار میں پیوست کر دیئے۔

تھکے قدموں سے، ہارے ہوئے مسیحا قطار بنا کر لوٹ گئے۔

کوئی اپنا نہیں تھا، کوئی سسکنے والا نہیں تھا۔

پھر سفید رنگ کے سربند ہیولوں نے خلا کو بھر دیا اور چند ہی ساعتوں میں ایک دھڑکتے ہوئے وجود کو عدم وجود میں بدل کر، ڈوریوں سے باندھ کر، ایک پتلے میں تبدیل کر دیا گیا۔

اسٹیچر دھیرے دھیرے ماربل کے فرش پر وہ ارتعاش پیدا کرتا ہوا دور ہوتا گیا جو ایک غیر مرتعش وجود کی غیر اختیاری حرکت سے پیدا ہو رہا تھا۔

درودیوار کی سانسیں چند لمحوں تک مٹی اور گارے میں پھیلتی اور سکڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

پھر............ سبز پوش فرشتوں کی آمد ہوئی، سرگوشیاں ہوئیں، سب کچھ بدل دیا گیا، بڑی سرعت کے ساتھ۔

نئی چادریں، نئے تکیے، نیا سامان، نئی دوائیں اور آلات۔

کوئی وجودی نشان نہیں بچا تو ایک اور وہیل چیئر برآمد ہوئی۔ ایک اور ذی روح آنکھوں کے سفید گلیاروں میں خوف لیکن پتلیوں کے سیاہ نقطے میں امید کی روشنی لیے، اسی بستر پر دراز ہو گیا۔

گھبرایا ہوا، سہما ہوا، ڈرا ہوا، لیکن جب سبز پوشوں کی پیشانی کے نیچے پرامید آنکھوں میں مسکراہٹ، یقین اور ہمدردی دیکھی تو مسکرا دیا۔

ساری گہما گہمی لوٹ آئی۔

میں نے اپنی جلتی سلگتی آنکھوں کو بند کیا تو ایک مہربان پرندے کے سفید، نرم، نازک، ملائم پنکھ نے میرے پپوٹوں کو ڈھک دیا۔

نیند کی وہ دیوی جس نے رات بھر انتظار کی صلیب پر لٹکائے رکھا تھا، دھیرے دھیرے آنکھوں میں گھل سی گئی۔

تیسرا دن، تیسری رات

تیسرا دن صبح ہی سے سیاہ وسفید لکیروں کے درمیان الجھا ہوا گزرا تھا۔ بارہ بجے کے قریب اسپتال کا کاروبار حسب معمول مصروف اور الرٹ ہو چکا تھا۔ جسے منزل مل گئی تھی وہ جا چکا تھا، باقی سب کبھی درد اور کبھی امیدوں اور مسکراہٹوں کے درمیان کانوں میں ہیڈفون لگائے، دل کے غرق اور ابھار کی گھڑیاں گن رہے تھے۔

میں اونگھ گئی تھی کہ اچانک خون ٹیسٹ کرنے والی سبز پوش قوم اپنے پورے ہتھیاروں اور اوزاروں کے ساتھ وارد ہوگئی۔

گھوڑے کو لگائی جانے والی جہازی سیرنج کو دو مرتبہ میرے بیمار خون سے بھرا گیا اور مختلف شیشے کی ٹیوبوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔

نفسیاتی طور پر کمزوری محسوس ہوئی کہ کتنی مشکل سے بننے والا سو ڈیڑھ سو گرام گہرا، سیاہی مائل سرخ خون میرے جسم سے جدا ہوگیا۔ محض چند قطروں کی جانچ ہوگی، باقی نالی میں بہہ جائے گا!

ایک بے کیفی، بے کسی، بے بسی، بے رسی اور بے سوادی کی سی کیفیت کے درمیان نفی اور اثبات کی کشمکش جاری تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو شکست دینے پر آمادہ

دراصل یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ ایک دوسرے کے رقیب بھی اور رفیق بھی۔ اور اگر کبھی فلم ''شعلے'' کا خود ساختہ سکہ سیدھا کھڑا ہو جائے تو دونوں کا اعتماد ڈگمگا جاتا ہے، دم بخود! انجام کے منتظر!

حسِّ شامہ اور حسِّ ذائقہ، دونوں ناراض تھے۔ نہ ناک میں کوئی تحریک نہ زبان پر کوئی ردِ عمل، بس شکم پوری مقصد تھا۔

ایک لایعنی، بے معنی، بے کاری کے دھند نے ذہن کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ بس اگر کچھ نمایاں تھا تو وہ تھا......

درد!

درد ہی درد ہے اور درد کی تفسیر یہ ہے
درد بیداری بھی ہے، خواب بھی، تعبیر بھی ہے

وقت رینگتا رہا۔ انٹراوینس نلکیوں کے ذریعے دوائیں خون میں سرایت کرتی رہیں۔ سانسیں اکھڑتیں تو ماسک پہن لیتی، قرار میں آتیں تو ماسک سرکا دیتی۔ وحشت ہی وحشت!

کمرے کی اکلوتی translucent شیشے کی کھڑکی کے پار مدھم ہو کر غائب ہو جانے والی روشنی نے احساس دلایا کہ شام کے سائے گہرے ہو گئے ہیں۔

موٹے شیشے کے خول نے نرم و نازک آوازوں سے سماعت کو محروم رکھا تھا لیکن نہ جانے کیسے زمینی کتوں اور آسمانی چیلوں اور کووں کی کریہہ الصوت آوازوں کا دم گھوٹنے سے وہ موٹا شیشہ بھی معذور تھا۔

پڑوس کے کمروں سے چیخیں اٹھتی رہیں، رات سرکتی رہی۔

نہ جانے ہر درد رات کو ہی کیوں جوان ہوتا ہے!!! اور نیند کی دیوی کیوں روٹھ کر میخانوں اور صنم خانوں میں پناہ لیتی ہے!!!

حضرت غالبؔ کے اس مشہور زمانہ شعر:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کا مفہوم اس سے پہلے اتنی اچھی طرح نہ کسی استاد کے سمجھانے پر واضح ہوا تھا، نہ حس شعری نے سمجھایا تھا اور نہ تشریحات کے کتب خانوں میں نظر آیا تھا۔

میری چھوٹی سی ڈائری اور قلم ہمیشہ میرے تکیے کے نیچے رہتے ہیں۔ موبائیل پر ٹائپ کرنے کی کوشش دردِ سر کو بڑھا دیتی ہے۔ لیکن رات کو نرس کی نظر بچا کر ماسک نیچے کرتے ہوئے، کروٹ کے بل لیٹ کر کچھ لکھنا چاہتی ہوں تو پڑوس کی مریضہ لڑکی کہتی ہے! ''Swich off the light please''، ''کیوں بھئی''! میں نے اپنی طرف کی لائٹ جلائی ہے، تم کروٹ بدلو اور سو جاؤ'' انانیت ابھرتی ہے۔

لیکن کسی کو بے آرام کرنا تو خصلت میں ہی نہیں ہے اور وہ بھی درد، کرب، آہوں اور سسکیوں کے اس جنگل میں!

لائٹ بند کر دیتی ہوں، لیکن......

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی!!!

چوتھا دن، چوتھی رات

شب قدر

چوتھی رات کی شام ڈوبی تو افطار کے بعد بچوں کے فون اور پیغام آئے۔

''مما آج ستائیسویں شب ہے۔

شب قدر کا امکان ہے''

اوہ! احساس جاگا

یہ تو بڑی مقدس اور بابرکت رات ہوتی ہے اور ہمیشہ اس کا انتظار رہتا تھا کہ شاید گناہ گار لبوں سے نکلی ہوئی کوئی دعا بابِ اجابت تک پہنچ جائے، یا کم سے کم نامۂ اعمال کی سیاہی میں کچھ لکیریں ہی مٹ جائیں۔

لیکن آج!!!

میں نے بیٹی سے پوچھا

''میں کیا کروں؟''

جواب آیا

"Take a chill pill"

آپ برسوں سے جو انشورینس بھر رہی ہیں نا، اس کے Claim کرنے کا وقت ہے۔ اللہ میاں اتنے ناانصاف نہیں ہیں کہ اس حالت میں بھی آپ سے کوئی ڈیمانڈ کریں۔"

(یہ نئی نسل بھی نا، کچھ بھی بول دیتی ہے)

بیٹوں نے جواب دیا۔

"آرام کیجیے، دعائیں کرنا ہمارا کام ہے۔"

تسلی نہیں ہوئی۔

اب عبادات تو ریشہِ حریر کے ٹکڑے کی طرح فرض نمازوں تک اس طرح محدود تھیں کہ نہ وضو کا ذکر اور نہ تیمّم کا اہتمام۔

دونوں ہاتھوں میں کہنیوں تک نلکیاں لگی ہوئی تھیں، پانی کا استعمال ممنوع تھا۔ پانچ ستارہ اسپتال کے کسی بھی کونے یا گوشہ دیوار پر مٹی کے ذروں کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر بھی دیوار پر ہاتھ مار کر فرض پڑھ لیتی تھی۔

لیکن آج کی رات، دل چاہتا تھا کہ جو زبانی ادائیگی ہو، اس میں کچھ تو اہتمام ہو۔

بہت سوچنے کے بعد دماغ کے کسی گوشے سے کسی شیطان یا مہربان نے یاد دلایا کہ میرے پرس میں گرمی دانوں پر لگانے والے موٹے، دردرے پاؤڈر کا ایک چھوٹا سا ڈبہ پڑا ہے۔

رات کی شکم پوری اور دواؤں کے لامتناہی سلسلے کے بعد جب پڑوس کی لڑکی نے لائٹ بند کروادی تو میں کہنیاں ٹیک ٹیک کر سرہانے کی دیوار تک پہنچی، ریتیلا پاؤڈر دیوار پر چھڑکا اور اس پر ہاتھ مار کر صرف اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے تیمّم

اور مسح کیا۔ نہ جانے پاکی ہوئی یا ناپاکی! لیکن کوئی چارہ نہیں تھا اور میں نے تکیوں پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں کہ زبان ہلانا دشوار تھا۔

بس کھو سی گئی۔

رات کا دوسرا پہر شاید ڈھل چکا تھا کہ ذہن کچھ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوگیا۔

وہ ایک مقام، جہاں کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں۔ کوئی آواز، کوئی ساز، کوئی منظر، کوئی معبد، کوئی عبادت، کوئی احساس، گناہ وثواب کا کوئی عکس بند آنکھوں کے پیچھے دھنکی ہوئی روئی کے ڈھیر کے ڈھیر۔

"قُل ھو اللہُ احد"

صرف ایک عظمت، ایک رعب، ایک دبدبہ!

نہ تھا کچھ تو وہ تھا، نہ ہوگا کچھ تو وہ ہوگا، وہ ہے...... وہ رہے گا۔

سیاہی چھٹتی ہے، ایک ہلکا سا روپہلا بادل، بند پپوٹوں کے پیچھے نور کے احساس کی چادر سی پھیلا دیتا ہے۔

"اللہُ نورُ السّماواتِ والا رضِ" وجودیت، عبدیت، دوئی کا احساس، اپنی ذات کا شعور، سب ختم۔

قطرے کو دریا مل جانا، کتنا پر سکون، لیکن کتنا لمحاتی!

کاش کچھ پل، کچھ لمحے اور ٹھہر جاتا، لیکن اس گناہ کار، سیاہ کار، آلودہ جسم و جان میں وہ ظرف کہاں کہ ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے بھی اسے روک سکتا۔

خاک کا وجود سمندر میں ملنے کے بجائے خاک میں مل گیا۔

کتنی تکلیف دہ تھی شعور کی یہ بازیابی!

رات نے پوری پہرے داری کی کہ نیند آنکھوں کے گلیاروں کے آس پاس بھی نہ پہنچے۔

غالباً سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ صبح کے کارندے اپنا رجسٹر سنبھال رہے تھے اور میں تھک گئی تھی لیکن دل کے کسی گوشے میں سکون کے ایک خفیف کے احساس کے ساتھ۔

شب قدر تمام ہوئی۔

شعور کی سطحیں بیدار ہوئیں۔ اسپتال کے کاروبار میں تندہی آ گئی۔ مریضوں کی پریشان کن اور اطمینان کن صدائیں ابھرنے لگیں۔

دن کے حصے میں شب قدر کو لے کر نوجوانی کے زمانے میں لکھی ہوئی ایک خرافاتی نظم ذہن کے تار تار دریچوں میں گنگناتی رہی۔

سر کا درد کچھ کم ہے۔ اس یاد کو بھی صفحہ قرطاس پر بکھیر کر محفوظ کر لوں۔

آج سے پینتالیس سال پہلے زندگی کے سولہویں ساون کے ماہ و سال میں انگریزی ادب کے دورِ رومانیت کے شاعروں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں بھی شدید رومانیت کا شکار ہو گئی تھی۔

Wordsworth کی Lucy اور Solitary Reaper،

Shelley کی Skylark

Keats کی "La Belle Dame Sans Merey"

اور

"Od to West Wind"

Lord Byron کی

"She Walks in Beautiy"

پھر دو قدم بڑھ کر

Lord Tennysonکی "The Brook"

Man may come and man may go, but i "
"may go foreever

Rosettiکی "Three Shadows"

وغیرہ وغیرہ وغیرہ...... ذہن کو جکڑے ہوئے تھیں، بہت سی تک بندیاں کیں جو محفوظ بھی نہیں رہ سکیں۔ ان ہی میں ایک نظم تھی:

"شب قدر"

لفظیات ذہن سے محو ہو گئی ہیں، لیکن کچھ یوں سی تھی کہ:

"تیری سیاہ آنکھوں کی پتلیوں میں، اک لحظے کے لیے مہر کی شب قدر چمکی تھی، میں نے چاہا کہ اس مقدس روشنی سے بہت کچھ مانگ لوں، لیکن بے لفظی کا سیلاب سر سے گزر گیا اور شب قدر کی روشنی اندھیروں میں ڈوب گئی۔"

ساڑھے چار دہائیاں گذر گئیں۔ سب کچھ بدل گیا، لیکن آج بھی لگا کہ وہ بے لفظی وہیں کھڑی ہے۔

شب قدر کی روشنی نے جھلک دکھائی لیکن، گناہوں کا اندھیرا، اس قدر گہرا ہے کہ وہ ٹھہر نہ سکی، ڈوب گئی اور میں آج بھی تہی دست کھڑی ہوں۔

(یہ صرف میرے محسوسات ہیں، اصل میں کوئی شب قدر نہیں چمکی تھی۔)

پانچواں دن

''یوم مادر''

ایک ماں کو نہیں معلوم تھا کہ آج عالمی یوم مادر ہے، کیونکہ اسپتال کی دیوار پر کوئی کیلنڈر نہیں ہوتا اور کیونکہ موت اور شفا کے پاس نہ کوئی روزنامچہ ہوتا ہے اور نہ دنوں اور تاریخوں کا کوئی لیکھا جوکھا۔ تو پھر کیلنڈر کے سفید پھڑ پھڑاتے ہوئے صفحات پر آنکھیں کیوں تھکائی جائیں! کبھی اچانک اطلاع ملتی ہے ''رپورٹس ٹھیک ہیں، گھر جاؤ'' کبھی سماچار آتا ہے ''رپورٹنگ بند ہوگئی، عدم آباد جاؤ''

اسپتال کی دیوار پر عموماً ایک بے رس سی پینٹنگ کا فریم جھول رہا ہوتا ہے تو مجھے کیسے معلوم ہوتا کہ آج میرا دن منایا جا رہا ہے۔!

صبح کے معمولات کی ڈیڑھ درجن دواؤں اور انجکشنوں کے جسم میں انتقال کے بعد جب حواس مجتمع ہوئے، سانسوں کے زیر و بم اور دل کی دھڑکن نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور میں نے دکھتی ہوئی انگلیوں کی جنبش سے موبائل کھولا تو یکا یک محسوس ہوا کہ کمرے کی سفید بے رنگ دیوار پر سرخ گلابوں کے جھاڑ سج گئے ہوں،

جن کے زیرِ سایہ بہت سے خوش قسمت اپنی ماؤں کے آغوش میں سر ٹکائے طمانیت کی سیلفی کھینچ رہے ہیں۔

اچھا لگا،

رمضان کا مہینہ ہونے کی وجہ سے سحری کی رونق تھی، بعد نماز بچوں نے گلدستوں کے ساتھ نیک خواہشات، محبت اور عقیدت کے گلہائے رنگارنگ سے موبائیل کے اسکرین کو گل زار بنا رکھا ہے۔

اور اچھا لگا!

اپنی اولادوں کے بعد بھائیوں کی اولادوں، بہنوں کی اولادوں، دوستوں کے پھول اور مبارکبادیاں سمیٹتے سمیٹتے دامن بھر گیا۔ دل کے نہاں خانوں میں طمانیت کا احساس رچ بس سا گیا۔

بہت اچھا لگا۔

یہ احساس بھی ہوا کہ کاش آج میں بھی کسی کو پھول بھیج سکتی!

تصاویر کے نیچے لوگوں کے اعتراضات اور اظہار خیالات کے تیر اور گل افشانیاں بھی پڑھیں۔

زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ "یوم مادر کا ایک ہی دن کیوں!

"ماں کا تو ہر دن ہوتا ہے اور ہر دن یوم مادر منایا جانا چاہیے۔"

صحیح ہے۔ ماں تو وہ وجود ہے جو اپنی محبتوں، قربانیوں، خدمتوں اور جذبوں کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ ہمیشہ آس پاس ہی مہکتی رہتی ہے۔ تب ہی تو خالق کائنات نے زر و جواہرات کے طشت (ٹرے) میں فردوسِ بریں سجا کر اس کے قدموں تلے رکھ دی ہے۔

لیکن

لیکن

میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ لاکھوں گھر ایسے بھی ہوں گے جہاں اگر سال میں ایک دن کی رونقیں بھی دستک نہیں دیں گی تو سال بھر کسی کو اس کے وجود کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ اس کی زندگی اولاد پر محبتوں کو لٹانے اور ان کی توقعات کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنے نفس کو بے بضاعت کرتے ہوئے اسی معمول کے چکرویوہ میں الجھی ہاتھ پاؤں مارتی رہے گی۔

ماں بچے کی لائف لائن ہوتی ہے۔ اس عالم آب وگل میں آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی پورے حق کے ساتھ اپنے وجود کی بقا کے لیے وہ ماں سے حیاتین کشید کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس میں تھوڑی سی کمی بھی اسے جز بز اور ناراض کر دیتی ہے۔

ماں تا عمر اولاد کے لیے آکسیجن کی فراہمی کا ذریعہ بنی رہتی ہے اور اولاد کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی۔ اولاد بے حساب وحد آکسیجن کا اپنے آپ کو حق دار سمجھتی ہے اور اسے آلودہ و متعفن کر کے پھر اسی پر چھوڑ دیتی ہے۔

ہاں جب یہ آکسیجن کم ہونے لگتی ہے، حیاتین کے چشمے خشک ہونے لگتے ہیں، زندگی دشوار راہوں کی طرف مڑنے لگتی ہے تو اس آکسیجن کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اور ماں کے وجود سے ساری آکسیجن کشید کرنے کی تگ و دو میں جٹ جاتی ہیں اولادیں، یہ سوچے بغیر کہ ماں کے جسم نامی سلنڈروں میں خود اس کے لیے بھی کچھ بچا ہے یا نہیں!

بڑے بڑے سعادت مند، بڑے بڑے اطاعت گزار، بڑے بڑے ماں کے شیدائی، اس پر شعر و ادب کے اوراق سیاہ کرنے والے، دنیا کی نظروں میں ماں کی

محبت کا ڈنکا بجانے والے! ان میں سے کتنے ہوں گے جنھوں نے قرآن وحدیث کے حکم کے مطابق ماں کے سامنے کبھی ''اُف'' نہیں کی ہوگی!

اس کے ہر لفظ کو ماتھے سے لگا کر چسپاں کرلیا ہوگا! کبھی حکم عدولی نہیں کی ہوگی! کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا ہوگا!؟؟

ماں دراصل سراپا دل ہوتی ہے۔ وہ دل سے سوچتی ہے، دل کی کرتی ہے اور دل کو اولاد پر نچھاور کر کے بھی ڈرتی رہتی کو کہیں، کوئی کمی تو نہیں رہ گئی!

جب کہ نوعمر اولادیں جانتی ہیں کہ یہ سب غیر حقیقی اور غیر منطقی ہے۔ سائنس کہتا ہے کہ دل تو محض جسم کو خون فراہم کرنے والا ایک آلہ ہے جو نہ سوچ سکتا ہے۔ نہ عمل کرسکتا ہے اور نہ کوئی فیصلہ لے سکتا ہے۔ شہنشاہ تو دماغ ہے، ساری حسّیات کو کنٹرول کرنے والا۔ سارے جسمانی نظام کو چلانے والا، دل کو ان معاملات میں درمیان میں لانے والے تو جاہل مطلق ہیں۔

اگرچہ تصوف کے نظریے اور اولیاء اللہ کے عقیدے کے مطابق زندگی کی اصل آماجگاہ تو قلب یا دل ہی ہے۔

جس نے دل کا دامن چھوڑا اس نے ایمان ویقین، وحدانیت و بندگی، بندہ نوازی، رحم وانصاف اور سب سے بڑھ کر عشق کے دروازے خود پر بند کر لیے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

تو دل کے اشاروں پر چلنے والی ماں، محبت شفقت، بے نفسی اور اپنی بے وجودی کو اولاد کے لیے خاکستر کرنے والی ماں تو دنیا کے اس نمائشی بازار میں بے قدر و قیمت ٹھہرتی ہے نا! جس کی ہر بات جذبات جیسے کھوٹے سکوں سے تولی جاتی ہے۔ قدم قدم پر اس کے اعتماد کی دھجیاں بکھیر کر اسے جتایا جاتا ہے کہ آپ کے خیالات،

آپ کے نظریات، آپ کی سوچ، آپ کی خدمات ناقص ہیں، پرانی ہیں اور وہ اولاد کے ہر ممکن سکون واطمینان کے لیے اپنی ہستی داؤ پر لگاتی رہتی ہے۔

میں اولاد کو زیادہ الزام نہیں دیتی، ان کی سوچ نئی ہے، مختلف ہے۔ ان کے سامنے ان کی اپنی زندگی بکھری پڑی ہے، اپنے ارادے، اپنی تمنائیں، اپنے منصوبے، اپنی مہتو آکانشائیں، اپنے حوصلے للچا رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں ماں کہیں پس منظر میں چلی جاتی ہے، مس فٹ لگنے لگتی ہے۔

کہتے ہیں، بیٹیاں، ماں کو بہت چاہتی ہیں لیکن پھر...... ان کا اپنا گھر بار، خاندان، سسرال، شوہر، بچے، مصروفیات، مسائل، دشواریاں...... کیا یہ ممکن ہے کہ ہر وقت ماں کے بارے میں سوچ سکیں۔

بیٹے بھی بہت سے، بہت سعادت مند ہوتے ہیں۔ ماں کو ساتھ رکھتے ہیں، اس کی آسائش کا خیال رکھتے ہیں......۔

لیکن ان کی زندگی میں در آنے والے نئے رشتوں کے تقاضے، ایک ایسے وجود کا شمول جو ماں کی ذمہ داریوں کو اپنے سر اوڑھ کر اپنے طریقے سے نبھانا چاہتا ہے، اپنا وجود منوانے کے لیے، اپنا مقام گھر میں مضبوط بنانے کے لیے اکثر خودغرض اور متعصب بھی ہوجاتا ہے۔ دخل اندازیاں اور اقتدار پر قبضے کی خواہش کبھی ناپسندیدگی اور زیادتی کا روپ بھی دھارتی رہتی ہے۔ اپنے وجود کا اثبات اور پرانے اقتدار کی نفی کہاں مہلت دیتی ہے کہ سال بھر اماں کو سر کا تاج بنا کر گھر میں سجایا جائے...... وہاں بھی تقاضائے بشریت پیدا ہوجاتا ہے اور آکسیجن کے ناب Knob کو کھول کر لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ تو ان کا پیدائشی حق ہے، ایسے میں جب زیست آبِ حیات کی ایک بوند کو ترس رہی ہو، مہربان دھرتی اچانک سنگ دل بن گئی

ہو، جب زمین کے سینے پر تڑختے ہوئے گہرے شگاف پڑ گئے ہوں تو ماں کا احساس، وہ ماما، شفقت اور محبت کا لازوال احساس، وہ اس کے ہاتھوں کا بہشتی لمس، وہ اس کی آنکھوں کا محبت لٹاتا سمندر، جو یوں تو کبھی کہیں نہیں جاتا، بعد از فنا بھی نہیں، لیکن اس ایک یاد سے اچانک ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔

آنکھیں بند اور ایک نرم و گرم گود کا سکون، بالوں میں شفیق انگلیوں کی ملائم حرکت، وہ ماورائیت، وہ آفاقیت جسے ہم زندگی کے مصنوعی سیلِ رواں میں کچھ دیر کو کہیں رکھ کر پس یادداشت ڈال دیتے ہیں، اس کا روحانی گلابی، پر سکون احساس ہر شے پر حاوی آجاتا ہے۔

تو پھر ۹ رمئی کو ماں کو ایک دن کے لیے تختِ محبت اور عقیدت پر بٹھا کر سچے یا جھوٹے پھولوں کے ڈھیر اس کے قدموں میں لگا کر، اسے کچھ پل کی خوشی دے دی جاتی ہے، تو برا کیا ہے؟

میں بین الاقوامی یوم مادر یا مدرس ڈے منانے کی پرزور حامی ہوں۔

پل بھر کے لیے کوئی ہمیں پیار کرلے

جھوٹا ہی سہی۔

پانچویں رات اور چھٹا دن

حدیثِ دیگراں، دردِ غیر کا احساس

میں اسپتال کے جس کمرے میں داخل ہوئی تھی وہ دراصل سنگل روم تھا، لیکن مریضوں کی کثرت اور بیڈ کی قلت کی وجہ سے ایسے سب ہی کمروں کو دو بیڈ والے کمروں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اصلی سہولیات ایک ہی بیڈ کو حاصل تھیں، دوسرے کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔

اس کمرے میں پہلے ہی سے 30/32 سال کی ایک اسمارٹ، تعلیم یافتہ لیکن مغرور سی لڑکی متمکن تھی۔ نہ جانے کس کس عذاب سے گذر چکی ہوگی۔ خود میں گم، صرف اپنے موبائیل کے ہیڈ فون لگائے باتیں کرتی رہتی یا نرسوں اور ڈاکٹروں سے الجھتی رہتی۔ کسی اور سے رابطے یا ایک نظر کی بھی خواہاں نہیں تھی۔ میں خود اپنے آپ میں اس حد تک گرفتار تھی کہ کسی طرف دیکھنے کی چاہ بھی نہیں تھی، لیکن بیڈ اتنے قریب تھا کہ نہ چاہ کر بھی فون پر اس کی سرگوشیاں کانوں میں پڑتی رہتی تھیں جو وہ اپنے والدین، بہن یا کسی مرد دوست سے کرتی رہتی تھی۔

اس نے میری کبھی کوئی مدد نہیں کی تھی گو کہ اسے آکسیجن سرہانے کی طرف سے نلکیوں سے حاصل تھی جب کہ میرا سلنڈر پاؤں کی طرف سے جوڑا گیا تھا، اس لیے ٹیوب اور نلکیاں اکثر پاؤں کی تکلیف دہ جنبشوں سے الجھ جاتے تھے جنہیں میں خود ہی اپنے پاؤں سے سلجھانے کی کوشش کرتی یا نرس کو بلاتی، نرس کو بلانے کی اطلاعی گھنٹی بھی اسی طرف تھی لیکن میری درخواست کے بغیر اس نے کبھی مدد کا کوئی ارادہ نہیں کیا۔

پانچویں دن ہم دونوں کے تمام ٹیسٹ دہرائے گئے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم نے دھاوا بولا تو ہمارے یونٹ انچارج ڈاکٹر نے اس سے کہا۔

"آپ کافی ٹھیک ہیں۔ کل کی رپورٹس او کے ہوئیں تو کل آپ کو ڈسچارج کر دیں گے۔"

مجھ سے کہا "آپ کو کچھ دن اور رہنا پڑے گا۔" میں نے دیکھا کہ وہ پھول کی طرح کھل گئی۔ اس نے ہیڈفون کانوں میں ٹھونسے اور رابطوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلے باپ کو خوش خبری سنائی۔

"میرے انشورینس کے سب پیپر نکال لینا اور صبح ٹائم پر پہنچ جانا"

پھر ماں سے بات کی

"ماں کل میرے لیے فرائڈ رائز اور چاؤمین بنوا دینا۔ اسپتال کا بورنگ کھانا کھا کر میں اوب گئی ہوں"۔

پھر غالباً بہن سے بات کی۔

"کل چھٹی مار لینا۔ میرا روم صاف کروا لینا۔ میرا پنک والا سوٹ پریس کروا لینا۔

کل شام اودیش بھی آئے گا۔"

’’کیوں؟ وہ کیوں نہیں آسکتا، فرینڈ ہے میرا۔ میں دس دن بعد اس Pendemic سے باہر آرہی ہوں۔ آپ لوگ اتنا نہیں سوچ سکتے میرے لیے۔
’’Papa has to change his out look‘‘ اس کی سرگوشیاں میرے ذہن میں کہانیوں کو جنم دیتی رہیں۔ وہ سارے دن اتنی پرجوش رہی کہ ذرا ذرا دیر پر فون پر باتیں کرتی رہی۔

اگلے دن وہ کچھ تھکی ہوئی سی تھی۔ نرس بار بار آکسیجن لگا جاتی اور وہ ہٹا دیتی۔ نہائی دھوئی، گھر کے کپڑے نکالے، اپنا سامان سمٹتی رہی، ڈاکٹر کے وزٹ کے بارے میں اسٹاف سے باز پرس کرتی رہی۔ دوپہر بعد ڈاکٹر آئے۔ پہلے میری طرف آئے۔ اطلاع دی ’’میڈم آپ کو ابھی ٹائم لگے گا۔ ہم کووڈ سے لڑنے کے لیے شریر میں جو anti bodies ڈالتے ہیں وہ آپ کے اندر react کر گئے ہیں۔

alarming rate سے بڑھ رہے ہیں۔ ڈر ہے کہ خود آپ کے سسٹم کو ہی نقصان نہ پہنچانے لگیں۔ But don't worry، ہم انہیں کنٹرول کرلیں گے۔ بس ٹائم لگے گا۔‘‘

اس تمام عرصے میں اس لڑکی کی بے چینیاں عروج پر تھیں۔ جیسے ہی ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہوئے وہ بول پڑی۔ ’’لیکن ڈاکٹر میرا تو آج ڈسچارج ہے نا؟ میں تو ٹھیک ہوں۔‘‘

ڈاکٹر نے اس کی فائل پر نظر ڈالی پھر بولے ’’ہماری دیکھ بھال سے تھک گئیں کیا مس سنگھ! آپ کو بھی ایک دو دن رکنا پڑے گا۔ تھوڑا Complication ہے، لیکن you will get over it soon۔‘‘

ڈاکٹروں کا وزٹ ختم ہوا، نرسوں کا کاروبار شروع ہوا۔ انجکشنوں کی تعداد بڑھ گئی۔

میں نے دیکھا اس نے کانوں سے ہیڈفون نکال کر پھینک دیئے، اپنے کپڑے واپس بیگ میں ٹھونس لئے۔منہ پر آکسیجن لگانے سے پہلے فون کیا۔

''پاپا، میرا آج ڈسچارج نہیں ہے۔'' اورفون بند کر کے ڈال دیا۔فون کی گھنٹی بجتی رہی، لیکن اس نے کال نہیں لی۔ میں نے اس کے شانوں پر سسکیوں کی آہٹ محسوس کی۔کھانا رکھا رکھا ٹھنڈا ہو گیا۔

میرا دل اندر سے دکھ سا گیا، یا اللہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔مجھ سے آدھی عمر کی ہے۔ابھی تو اس نے زندگی شروع بھی نہیں کی ہے۔اسے نئے خواب سجانے ہیں، زندگی شروع کرنی ہے، عورت ذات کی تقدیس حاصل کرنی ہے۔دل نے خواہش کی ''یہ ٹھیک ہو جائے۔!''

تھوڑی دیر بعد جب میں کانپتے ہوئے قدموں سے دیوار کا سہارا لے کر واش روم جارہی تھی تو اس نے اچانک ہی سر اٹھایا اور میری آستین کو پکڑ کر پوچھا۔

''آنٹی میں ٹھیک ہو جاؤں گی نا؟''

غیر اختیاری طور پر میری نظر اس کی سرخ آنکھوں سے ٹکرائی اور اس کے آنسو میرے رخساروں پر پھسلتے چلے گئے۔

''ہاں بیٹا''۔میں نے بمشکل کہا ''بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی اور کل ہی اپنے گھر جاؤ گی انشاءاللہ۔''

اگلے دن اسے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔سہ پہر کو گھر جاتے ہوئے اس نے رک کر میرے پاؤں کے انگوٹھے کو ہلکے سے چھوا۔

''Thank you aunti, thanks you for everything''

چھٹی رات ساتواں دن

آپ نے دیکھا کہ اسپتال کے قیام کے ان سات دنوں میں، پہلے دن میں اور آخری دنوں میں میرے احساسات، نظریات اور میری لفظیات کس طرح طلسماتی طور پر بدلتی رہیں۔ پہلے تین دن کچھ نہیں تھا۔ صرف اللہ یاد تھا، صرف دعا تھی، ناامیدی کے اندھیرے میں روشنی کے ایک نقطے کی تلاش تھی جو کبھی بجھتا تھا اور کبھی جل جاتا تھا۔ ہاتھوں کو پھیلاتی تو موت کا فاصلہ کم محسوس ہوتا، زندگی دور کھڑی للچا رہی ہوتی تھی۔ کسی کے لیے دل میں کچھ برا نہیں تھا، کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی، کسی چیز میں نقص نظر نہیں آتا تھا، ناشکری کا کوئی خیال نہیں تھا۔

لیکن جیسے جیسے امید، ناامیدی کے ہتھیاروں کو کند کرتے ہوئے فتح کی طرف قدم بڑھانے لگی، ساری آلودگیاں، سارے وسوسے، سارے خدشات، اعتراضات شکوے شکایات سر اٹھانے لگے۔

دراصل انسان کی تخلیق جن چار عناصر سے ہوئی ہے یعنی آب و آتش، خاک و باد، ان میں سے تین عناصر میں آلودہ ہو جانے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ مٹی اتنی پاک بھی ہے کہ تیمّم کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اتنی گندی بھی کہ کیچڑ بن جاتی ہے۔

پانی جو پاکی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے وہ بھی بڑی آسانی سے آلودگیوں کو سمیٹ لیتا ہے اور اپنی شفافیت کھو دیتا ہے۔ ہوا بھی ہمیشہ سبک اور معتبر نہیں۔ ناپسندیدہ خشبیتں اسے بھی آلودہ کر دیتی ہیں۔ رہی آگ تو بے چاری تینوں ساتھیوں کے برتاؤ سے تنگ رہتی ہے کبھی غصے میں جلا کر خاک کرنے پر تل جاتی ہے تو کبھی ٹھنڈی سی نظر کے ساتھ سب کچھ جھیل جاتی ہے اور خاموشی سے سلگتی رہتی ہے۔ تو ان چار عناصر سے بنا انسان کیسے ان چھوا رہ سکتا ہے۔ نبیوں اور ولیوں کی بات تو اور ہے ورنہ عام آدمی، ذرا اطمینان ہوا اور ایمان ڈانواڈول ہونا شروع ہو گیا۔ حکایتیں، شکایتیں، غیبتیں، اعتراضات سب شروع ہو جاتے ہیں۔

ذہن وسوسوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور اپنی ڈگر سے ہٹ جاتا ہے۔ بقول کبیر کے:

دکھ میں سمرن سب کریں سکھ میں کرنے نہ کوئے
جو سکھ میں سمرن کریں تو دکھ کا ہے کو ہوئے

میرے پڑوس کے بیڈ والی لڑکی کو گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ کمرے کی صفائی ستھرائی کا کام ختم ہی ہوا تھا کہ ایک اور وہیل چیئر کھڑکھڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور خالص امریکن لہجے میں انگریزی میں Housekeeping اسٹاف کو ڈانٹتی ڈپٹتی ایک نسوانی آواز سن کر میں نے کروٹ بدلی کہ یا خدایا کیا پڑوس میں اب کے کوئی فرنگن آ گئی!

وہیل چیئر پر ساٹھ سالہ خاتون متمکن تھی جس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو تین چار رنگوں کی پٹیوں میں رنگا ہوا تھا۔ جینس اور اونچی سی بغیر آستینوں والی ٹی شرٹ میں ملبوس ایک سانولی سی عورت دیسی ہی تھی اور وہ اسٹاف پر اس لیے برس رہی تھی کہ

بیڈ کی جو چادر ابھی بدلی گئی تھی اس کے کنارے پر مکھی کے پر کے برابر نیلے رنگ کا دھبہ پڑا ہوا تھا اور وہ اس ''ڈرٹی'' چادر والے بیڈ پر بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسپتالوں میں نرسیں عموماً انگریزی سمجھنے والی اور بولنے والی ہوتی ہیں لیکن ہاؤس کیپنگ اسٹاف کا ہاتھ انگریزی میں ذرا تنگ ہوتا ہے اور وہ بھی ودیشی لہجے کے ساتھ۔ چنانچہ دونوں مددگار لڑکیاں حیران پریشان کھڑی تھیں۔ جو آدمی وہیل چیئر ڈھکیل کر لایا تھا وہ الگ پریشان تھا کہ آخر میڈم کرسی سے اترتی کیوں نہیں؟ اسے اور بھی مریضوں کی مدد کے لیے جانا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میڈم کو کیا شکایت ہے؟ میرے بتانے پر دونوں لڑکیوں نے ناگواری کے ساتھ لیکن فوراً ہی چادر بدل دی۔ تب وہ ہندوستانی فرنگن کرسی سے اتر کر بیڈ پر بیٹھی۔ دوسرا مرحلہ اسپتال کے کپڑے پہننے کا تھا۔ وہ کسی طرح اپنا لباس فاخرہ اتار کر اسپتال کا ''بورنگ ڈریس'' پہننے پر راضی نہیں تھی۔ آخر نرس کے اصرار پر اسے یہ ناگوار فرض بھی انجام دینا پڑا۔

شام کی چائے کا وقت ہو چکا تھا۔ کیٹرنگ اسٹاف کا لڑکا ڈِپ (dip) کی چائے اور میونی اور سلاد کا سینڈوچ ان کی میز پر رکھ کر چلا گیا۔ محترمہ نے ناشتے کی ٹرے کا کور اٹھا کر دیکھا اور بولیں نہ تو وہ ایسی چائے پیتی ہیں اور نہ شام کی چائے کے ساتھ سینڈوچ کھاتی ہیں۔ انہیں کچھ Healthy چاہئے تھا۔ ناشتہ لانے والے لڑکے نے کہا ''میڈم یہاں سب مریضوں کو یہی کھانا ملتا ہے۔ آپ کو کچھ اور چاہیے تو ڈیوٹی ڈاکٹر سے لکھوالیں''

''یا خدا!'' میں چائے پیتے ہوئے سوچ رہی تھی ''یہ عورت بیمار تو کسی طرح سے نہیں لگ رہی۔ پھر یہ یہاں کووڈ وارڈ میں کیا کر رہی ہے! کہاں آٹھ دن کی پوری دیکھ بھال اور دواؤں کے بعد یہ عالم تھا کہ نہ آواز نکل رہی تھی اور نہ خود سے اٹھ کر بیٹھا

جا رہا تھا اور کہاں یہ ناز نخرے!''

مجھے چائے پیتا دیکھ کر غالباً اس کی بھوک بھی چمک گئی تھی۔ کچھ پس و پیش کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا ''Do you have some sweet nuts''، میں حیران کہ یہ ''سویٹ نٹ'' کس چڑیا کا نام ہے؟'' میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس کسی قسم کے کوئی nuts نہیں ہیں۔ جب میں یہاں لائی گئی تھی تو مجھے خود اپنا ہی ہوش نہیں تھا کہ نہ کہ یہ عیاشیاں ساتھ لاتی!''

اس نے بتایا کہ وہ شام کی چائے کے ساتھ صرف nuts کھاتی ہے جو اس کی آسٹوپڈ میڈ'' پیک کرنا بھول گئی......''

یا خدا یہ بیماری کا علاج کرنے آئی ہے یا پکنک منانے! میں حیران تھی۔

پہلے اس نے نوکرانی کو فون کر کے برا بھلا کہا کہ اس کے کھانے کا بیگ کیوں پیک نہیں کیا؟ غالباً نوکرانی نے کہا ہوگا کہ اس نے تو پیک کر دیا تھا ڈرائیور لے جانا بھول گیا۔

پھر ڈرائیور کو فون کر کے انگریزی میں گالیاں دیں، نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی اور حکم دیا کہ فوراً بیگ اسپتال پہنچائے۔ پھر غالباً شوہر کو فون کر کے نوکرانی، ڈرائیور، اسپتال کے اسٹاف کی شکایتیں کیں۔ میرے یہ بتانے پر کے اسپتال میں باہر سے کوئی چیز لانا منع ہے اس نے چائے اور سینڈوچ کے ساتھ پورا انصاف کیا لیکن برابر برا بھلا کہتی رہی۔ کسی نہ کسی کو اور آخر میں دہلی کے موسم، آب و ہوا اور آلودگی کو، کووڈ کی بیماری کو اور بدقسمتی سے مخاطب میں ہی تھی۔

مجھ سے ضبط نہیں ہو سکا تو میں نے پوچھ لیا ''آپ کہاں سے آئی ہیں''؟

جواب ملا ''دہلی سے''۔ میں نے پوچھا ''دہلی میں کب سے ہیں؟'' وہ بولی ''تیس سال سے'' اللہ توبہ۔ بات تو ایسے کر رہی ہے جیسے ابھی ابھی لندن سے آ کر اتری ہو۔''

تبھی نرس اس کا معائنہ کرنے آئی۔ اس سے بھی ایسے بات کی جیسے اس کی ذاتی نوکر ہو۔ نرس خاموشی سے واپس چلی گئی تو میں نے اسے گیان دیا" یہ بہت اچھا اسپتال ہے۔ اچھی دیکھ بھال ہے۔ اسٹاف، ڈاکٹرز سب اچھے ہیں۔ مہربان ہیں، کھانا وقت پر اور گرم دیا جاتا ہے۔ بس آپ ذرا نرمی اور شرافت سے بات کریں۔ شام تک وہ خاصی اوقات پر آچکی تھی۔ اگلے دن جب میں ڈسچارج ہو کر جانے لگی تو بولی"O! dear, I will miss you a lot"۔

اگلے دن گیارہ بجے ڈاکٹروں کی ٹیم جب اپنے راؤنڈ پر آئی تو میرے معالج ڈاکٹر نے میری ساری رپورٹس کی جانچ کی اور کہا کہ" آپ اب کافی بہتر ہیں۔ لیکن ابھی پوری ٹھیک نہیں ہیں۔ کووڈ کے علاج کا جو کورس ہم نے سات دن آپ کو انجکشنوں سے intra veinus دیا تھا وہی دوائیں اب سات دن اور چلیں گی۔ لیکن اب دوائیاں (گولیوں) کی شکل میں دیں گے جو آپ (Orally) منہ سے بھی کھا سکتی ہیں۔ اگر آپ گھر جانا چاہیں تو جا سکتی ہیں لیکن دوائیں پابندی سے لیں۔ کوئی complication ہو تو آپ آن لائن مجھ سے بات کر سکتی ہیں۔ پندرہ دن بعد کورونا نگیٹو ہو جاتا ہے لیکن نارمل ہونے میں کم سے کم تین ماہ لگیں گے۔ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی" میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے ڈسچارج کر دیں۔"

انہوں نے میری فائل پر ڈسچارج لکھتے ہوئے کہا" آپ کو کورونا ہوئے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ آپ تین دن گھر پر isolation میں رہیں پھر آپ بے جھجک اپنے گھر والوں سے مل سکتی ہیں۔"

حالانکہ میری تکلیفیں ابھی بھی بڑی حد تک باقی تھیں لیکن گھر جانے کا تصور ہی بے حد راحت افزا تھا۔

پھر ڈاکٹر میری پڑوسن کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی فائل دیکھی اور ان کی انگریزی سنی اور حیرت سے ان کی شکل دیکھی۔ اپنے جونیئر ڈاکٹروں سے تبادلہ خیال کیا۔ پھر ان سے کہا۔

''آپ کو تو کووڈ کا بہت mild infection ہے۔ آپ کو اسپتال میں بھرتی کرنے کا مشورہ کس نے دیا؟''

انہوں نے بڑی ادا سے بتایا کہ انہیں ہلکا بخار تھا۔ کورونا کا ٹیسٹ پازیٹو آیا تو ان کے شوہر نے کہا ''تم گھر میں infection پھیلاؤ گی، اسپتال میں بھرتی ہو جاؤ۔ شوہر کسی اونچے سرکاری عہدے پر تھے۔ ان کے سکریٹری نے سب انتظام کر دیا۔ ڈاکٹر غالباً مسکرائے۔ حالانکہ ماسک اور شیلڈ نے چہرے کو ڈھانک رکھا تھا لیکن ان کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ وہ لگاتار بکواس کرتی رہی۔ ڈاکٹر نے ان کے پچاس فیصد سوالوں کے جواب دیئے۔ نرسوں کو کچھ ہدایات دیں اور ان سے کہا۔ ''آپ دو تین دن میں ٹھیک ہو جائیں گی''۔ انہیں بڑی ناامیدی ہوئی نہ جانے کس کس کو فون کر کے کہتی رہیں'' بہت بے کار اسپتال ہے اور بے کار ڈاکٹر ہیں۔''

میرے ڈسچارج کی کاغذی کارروائیاں شروع ہوئیں تو شام کے پانچ بج گئے۔ شکر ہے کہ دوائیں، کھانا اور چائے ناشتہ وقت پر ملتا رہا۔ میں نے نرسوں اور دوسرے اسٹاف کا شکریہ ادا کیا اور شام کے دھندلکے میں ایک وہیل چیئر کھڑکھڑاتی ہوئی اسپتال کے باہر نکل آئی جہاں میرا بیٹا میرا انتظار کر رہا تھا۔

الحمدُللہ

افسانچے

دو باتیں

انگریزی کی مشہور کہاوت ہے Pen is mighter than sowrd
اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ قلم کار قبیلے کے ہمارے سب ہی ساتھی نہ صرف اس مقولے سے متفق ہوں گے، تائید کریں گے بلکہ اپنی زندگیوں میں اس پر عمل پیرا بھی ہوں گے۔ میں نے بھی ہمیشہ اس قول سے اتفاق کیا، لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ ''جن جھیلے تن جانے'' تو گزشتہ ایک سال میری زندگی میں اس طرح قہر بن کر آیا کہ اگر قلم نہ ہوتا تو زندگی رزندہ رہنا آسان نہ ہوتا۔

جب زندگی کے ہم سفر کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت بتدریج کمزور پڑتے پڑتے اچانک چھوٹ گئی، جب زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں سر سے سائبان چھن گیا اور زندگی بے معنی نظر آنے لگی تو اپنوں کی محبتوں کے بعد یہ قلم ہی تھا جس نے جینے کا حوصلہ دیا۔

کووڈ ۱۹ کے دورِ سیاہ میں کورونا سے جوجھتے ہوئے، جب کائنات میں یقین وکفر کا عالم جاری وساری تھا، جب نفی اور اثبات کی جنگ برپا تھی، جب زندگی موت سے نبرد آزما تھی، اپنے سب دور تھے، اگرچہ ان کی دعائیں برسرِ پیکار تھیں، بے یقینی و

بے بضاعتی، درد و کرب، بے چینی و بے بسی کا یہ عالم تھا کہ باہر آنے والی سانس بھی یہ یقین دلانے میں ناکام تھی کہ وہ واپس آئے گی۔ تب کسی نے سہارا دیا تو اس ذات باری تعالیٰ کے رحم اور اپنوں کے اٹھے ہوئے دست بدعا کے بعد یہ قلم ہی تھا جو مجھے مایوسیوں کے گرداب سے نکلنے کی وجہ مہیا کر رہا تھا۔ تب یہ یقین آ گیا کہ Pen is mighter than any other source of inspiration اور میں نے قلم کو تھام لیا۔ بہت کچھ لکھا شاعری کی، ترجمے کیے۔ افسانے لکھے یادداشتیں جمع کیں، کورونا کی ڈائری تو اسپتال میں ہی لکھی تھی۔ اس کے علاوہ افسانچے بھی لکھے۔ افسانچے جو کہ تخلیقی ادب میں نسبتاً ایک نئی صنف ہے اور اسے یہ نام بھی بعد میں ملا لیکن میں نے زمانہ طالب علمی میں منٹو کے سیاہ حاشیے، جوگیندر پال، رتن سنگھ وغیرہ سے متاثر ہو کر کئی مختصر ترین کہانیاں لکھیں جو آج افسانچے کے دائرے میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ دریں اثنا وقت گزاری کے لیے سوشل میڈیا سے بھی شغف رہا۔ یہاں مختلف گروپس سے رابطہ ہوا، خصوصاً مشہور فلم اور ٹیلی ویژن اسکرپٹ رائٹر اور فکشن نگار انور مرزا کے گروپ "افسانہ نگار" سے جڑنے کے بعد وہ بھولی داستان پھر یاد آ گئی۔ یہ گروپ بالخصوص افسانچہ نگاری کی ترویج و اشاعت کے لیے ہی قائم کیا گیا ہے اور مستقل طور پر مختلف عنوانات کے تحت ایوینٹ منعقد ہوتے رہتے ہیں جن میں نوجوان نسل کے متعدد فکشن نگار اپنا زورِ قلم آزماتے ہیں۔ اس گروپ سے بطور خاص مجھے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پڑھنے اور تبصرے کرنے سے بڑھ کر بے ارادہ ہی قلم متحرک ہو گیا۔ چنانچہ ساٹھ ستر کے قریب افسانچوں نے اپنے وجود کو منوا لیا۔ ان میں سے چالیس کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ ان میں افسانچہ نگاری کے فن کی باریکیاں مفقود ہیں

خصوصاً اختصار کی بہت کمی ہے۔ میں سو (100) یا پچاس (50) لفظوں میں مافی الضمیر واضح کرنے کی اہل نہیں ہوں۔ اس لیے ان کاوشوں کو نقادفن جو چاہیں نام دیں، منی کہانیاں، مختصر مختصر افسانے یا مائکروفکشن، میرے ذہن پر جو وارد ہو گیا اور جیسے وارد ہو گیا صفحہ قرطاس پر اتر گیا۔ اب اہل خرد و نقد و نظر یعنی قارئین خود ہی حکم لگائیں۔

تکمیلِ کائنات

اس نے بن سنور کر اپنے حجرے کے آئینہ خانے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ گھٹاؤں جیسے بال، ہرنوں جیسی آنکھیں، گلابوں جیسے ہونٹ، ہیروں سے ترشی ہوئی ناک، ستاروں کی چمک، دودھ کی سفیدی، شہاب کی سرخی، گلوں کی سی ملاحت، زمرد کی سی صباحت لیے کومل رخسار، سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، سرو کا سا قد، طاؤس کی سی گردن، مورنی کی سی چال۔

اتنا حسن، اتنی نزاکت، اتنا سحر، جیسے مصور کا شاہ کار! پھر بھی کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔ کیا کمی ہے؟ وہ حیران سی آئینہ خانے سے باہر نکل آئی۔ اس نے پہاڑوں کی بلندی سے، آبشار کی روانی سے، جھیل کے درپن سے، سبزے کی طراوتوں سے، پھولوں کی تازگی سے پوچھا ''میں کیسی ہوں؟'' سب خاموش رہے، رات ہوئی۔ اس نے تاروں کی چمک سے پوچھا، تارے چھپ گئے۔ چاند کے کملھائے چہرے سے سوال کیا، وہ گہنا گیا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ شبنم کے موتیوں میں اپنا عکس ڈھونڈھنا چاہا، وہ فنا ہو گئے۔ اسے جواب نہیں ملا۔ مایوس ہو کر وہ لوٹی۔ راہ میں ایک کٹیا سے وہ برآمد ہوا۔ بانکا، سجیلا، بلند، مضبوط، شہزادوں کی سی آن بان والا۔ اپنی آنکھوں میں مقناطیسی

کشش لیے وہ قریب آیا، ایک خواب کی طرح، بین کی دھن پر مسحور ناگ کی طرح، بے تحاشا، بے محابہ، بے ساختہ، قریب اور قریب اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں کھو گئے۔ جواب کی تلاش میں بھٹکتی مسافر کو اپنا جواب مل گیا۔

یکا یک پہاڑوں کا سر بلند ہو گیا، آبشار گنگنا اٹھے، کلیاں چٹک کر پھول بن گئیں، پھول مسکرانے لگے، سبزہ زندہ ہو گیا، جھیل کے درپن میں ان کا عکس پڑا تو وہ خوشی سے لہریں لینے لگا۔ شبنم کے موتی جاتے جاتے ہنس پڑے، افق کے کنارے گلگوں ہو گئے، ڈوبتے ہوئے مہتاب کے چہرے پر چمک آ گئی۔

مرد نے ہاتھ بڑھایا "میں عشق ہوں" عورت نے ادائے دلبری سے ہاتھ تھام لیا۔ "میں حسن ہوں"۔

وہ ساتھ چلے تو درختوں نے پھول فرش راہ کر دیے اور کائنات کی تکمیل ہو گئی۔

مٹی کی خوشبو

انجینئرنگ پاس کرنے کے بعد بھی نوکری نہ ملی تو لوگوں نے کہا ''ایم بی اے کرلو۔ انجینئر تو آج کل تھوک کے بھاؤ ملتے ہیں''۔

رامش کو بات میں صداقت نظر آئی۔ کئی مثالیں تھیں جہاں اس مرکب کے ذریعے لوگ اچھا کما رہے تھے۔

رو دھو کے MBA بھی ہو گیا اور درجنوں درخواستیں بھی دے دیں۔ اماں کو تو کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ مارے چاؤ کے پاؤں میں بیڑی بھی ڈال دی کہ آنے والی اپنے نصیب کا لے کر آئے گی۔

سال گذرا تو ہاتھ میں ہتھکڑی بھی پڑ گئی لیکن نصیب نہیں کھلا بلکہ نبیلہ جس غیر تسلیم شدہ اسکول میں پڑھاتی تھی، بیٹا ہونے کے بعد وہاں سے بھی چھٹی مل گئی۔ اماں کی قلیل فیملی پنشن اور چار کھانے والے۔

رامش کے ایک کینیڈا میں بسے دوست نے اصرار کیا تو رامش اماں کے جہیز کے کڑے بیچ کر پردیس پہنچ گیا۔ تقدیر نے یاوری کی، وہاں اچھی نوکری مل گئی۔ دو سال میں اتنا ہو گیا کہ خاندان کو بھی لے جا سکتا تھا۔

چھٹی لے کر گھر آیا۔ ماں، بیوی، بچے کا ویزا لگوایا۔

اماں نے سنا تو صاف انکار کر دیا۔

''بیٹا تم بیوی بچے کے ساتھ سدھارو۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اس مٹی میں میرا نال گڑھا ہے، میرے ماں باپ دفن ہیں، تمہارے ابا کی قبر ہے۔ اس مٹی کی خوشبو میری سانسوں میں بسی ہے۔''

نبیلہ اماں کا سامان پیک کر رہی تھی۔ رامش نے مزاحاً کہا ''سنو ایک تھیلی میں اماں کے لیے یہاں کی مٹی بھی پیک کر دو۔ اماں کو جب وطن کی یاد آئے گی تو سونگھ لیا کریں گی''۔

لیکن اماں ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ روانگی میں ایک دن رہ گیا تھا۔ رامش سمجھا کر ہار گیا تھا۔ تب ہی ننھا عروج آ کر اماں کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ اماں نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔ ''ٹھیک ہے بیٹا، لے چلو جہاں چاہو۔''

رامش نے سکھ کی سانس لی اور بیٹے کو لے کر خواب گاہ میں چلا گیا۔

اگلی صبح نبیلہ اماں کے لیے چائے لے کر گئی تو اماں سکون کی نیند سو رہی تھیں۔ مٹی کی محبت پوتے کی محبت پر غالب آ چکی تھی۔

مکافاتِ عمل

دبیر فلک عطارد جو کچھ لمحوں کے لیے غنودگی کی کیفیت میں بے خبر ہو گیا تھا، چونک کر اٹھا۔ اس کے سامنے کرہِ ارض سے آئی ہوئی رپورٹوں کے دفتر جمع تھے۔ اپنی لاپروائی پر لرزاں، اس نے اوراق پلٹنے شروع کیے تو انگشت بہ دنداں رہ گیا۔ اتنی نافرمانیاں! اتنی بداعمالیاں! خدائی کے دعوے! مظلوموں کا استحصال! مذہب کے نام پر سیاست کا ننگا ناچ! شریفوں کی بے حرمتی اور رذیلوں کا عروج! یہ ابن آدم تو فرعون بے سامان ہو گیا ہے، اُف! کہیں اپنے تساہل پہ موردِ سزا نہ ٹھہرایا جاؤں۔! فرض کی ادائیگی بھی ضروری تھی۔ منتظر فرشتے کے ہاتھ رپورٹ بھیجی ہی تھی کہ 'کن' کے ساز کی آواز تیز ہو گئی لیکن اس میں تعمیر کا نہیں بلکہ تخریب کا پہلو نمایاں تھا، غیظ وغضب تھا، حکم عدولی پر ناراضگی تھی، سزا کا اشاریہ تھا۔

عرش معلیٰ پر ہلچل مچ گئی۔ عبادت میں مشغول جبرئیلؑ کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔ اسرافیل پریشان ہو گئے، کیا صور پھونکنے کا وقت آ گیا! عزرائیل اپنے معاونوں کو خبردار کرنے لگے، میکائیل مستعد ہو گئے۔

احکامات جاری ہونے شروع ہو گئے۔

خورشید خاور کو حکم ہوا اپنی شعاؤں کو سم آلود کرے، مغنیہ فلک زہرہ کو حکم ملا، حسن و عشق اور بہاروں کے نغمے بند کرے اور خوف و تباہی کا ساز چھیڑے۔ مخرب فلک زحل کو حکم ہوا بلاؤں اور وباؤں کا رخ کرۂ ارض کی طرف موڑ دے، سعدِ فلک مشتری کو تاکید ہوئی کہ کچھ دن کے لیے اپنے فرائض کو موقوف کرے۔ رقیب فلک مریخ، جسے ہمیشہ یہ شکایت رہی تھی کہ اسے خورشید کا مقرب بنا کر زندگی سے محروم کردیا گیا ہے اور جس کا ابلیس سے یارانہ تھا، اس نے ان احکامات کا مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا اور دوست کے ساتھ مل کر تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہوگیا۔ میکائیل کو حکم ہوا سیلاب، قحط اور زلزلوں کی رفتار تیز کردیں۔ عزرائیل حیران تھے۔ طوفانِ نوح کے بعد سے کرۂ ارض کی صدیوں کی تاریخ میں بارہا مختلف علاقوں میں انہیں جنگوں، وباؤں اور قدرتی حوادث میں ہزاروں انسانوں کی روح قبض کرنے کے احکامات ملے لیکن یہ کیسا حکم تھا جو بہ یک وقت پورے کرۂ ارض پر محیط تھا۔

عرش پر ایک ہنگامہ بپا تھا اور دنیا میں لاک ڈاؤن ہوگیا تھا۔

''مجھے کیا برا تھا مرنا اگر......''

بادشاہِ وقت نے جب محسوس کیا کہ فرہاد نامی یہ آدمی تو شہزادی شیریں کے پیچھے ہی پڑ گیا ہے اور شہزادی بھی اس کے عشق میں دیوانی ہوئی جارہی ہے تو اس نے اپنے وزیر کو جو عقل و دانش میں لقمان کا ونشج تھا بلایا اور مشورہ کیا۔ وزیرِ باتدبیر نے ایک رام بان تجویز پیش کی۔

اگلی صبح بادشاہ نے فرہاد کو بلایا اور پوچھا ''تم شیریں کو پانے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟'' فرہاد نے جواب دیا ''جان بھی دے سکتا ہوں جہاں پناہ! پہاڑوں کو کاٹ کر دودھ کی نہریں بہا سکتا ہوں۔ صحرا کو گلزار بنا سکتا ہوں'' بادشاہ نے کہا ''نہیں نہیں! ہمیں یہ سب کچھ نہیں چاہئے۔ یہاں سے مشرق کی طرف سمندر پار ایک ملک ہے ہندوستان۔ وہاں کے دارالسلطنت دہلی چلے جاؤ۔ جدوجہد کرو، ایک ماہ میں دس لاکھ روپیہ کما کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔ شیریں تمہاری ہے۔''

فرہاد خوشی خوشی فوراً روانہ ہوگیا۔ دہلی پہنچ کر دیکھا کہ یہاں تو قیامتِ صغرا کا منظر ہے۔ وبا نے قہر مچا رکھا ہے۔ گھر کے گھر بیماروں سے بھرے ہیں۔ صاحب روزگار بے روزگار ہو گئے ہیں۔ اسپتالوں میں لوگ دواؤں اور دیگر اشیاء کی کمی سے

مر رہے ہیں۔ قبرستان اور شمشان میں جگہ نہیں ہے۔

باصورتِ مجنوں ایک ماہ دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد، جو پونجی لایا تھا وہ بھی ختم ہوگئی۔ وبا کا شکار ہوکر بھوکے پیٹ ڈاکٹر، دوا اور آکسیجن کی عدم دستیابی سے جھوجھتے ہوئے ایک سرکاری اسپتال کے سامنے فرہاد نے آخری سانسیں لیتے ہوئے سوچا۔ ''کاش جہاں پناہ نے کوہ کنی کی شرط رکھی ہوتی۔''

فرار

آشرم میں ہلچل مچ گئی۔ چین سے ایک ایسی بیماری آئی ہے کہ آدمی چلتے پھرتے، کھڑے کھڑے بیمار ہوتا ہے اور مرجاتا ہے، جو اسے چھولے وہ بھی مرجاتا ہے۔ ساری دنیا میں لاک ڈاؤن ہو چکا ہے اب بھارت میں بھی ہونے والا ہے۔

سوامی جی نے سنا تو ان کے چہرے پر خوف کا سایہ سا گزر گیا۔ جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔ اسّی سال کی عمر میں بھی مایا موہ سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ سینکڑوں آدمی دن میں ان کے چرن اسپرش کرتے تھے! جان بچانے کا ایک ہی طریقہ نظر آیا۔ معلوم کیا لاک ڈاؤن کب تک چلے گا؟ بتایا گیا ''دو تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے''۔

انھوں نے اعلان کیا ''ہم بھگتوں کے کلیان کے لیے سمادھی لیں گے۔''

آناً فاناً میں خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ انتظامیہ سے اجازت ملتے ہی مقررہ دن، تاریخ اور وقت پر ضلع کلکٹر، پولیس اور ڈاکٹروں کی ٹیم کے علاوہ بھگتوں کی موجودگی میں ٹھیک تین بج کر دس منٹ پر یوگ اوستھا میں بیٹھے ہوئے سوامی جی کو سمادھی میں اتار کر سمادھی کو پاٹ دیا گیا۔ نشانی کے لیے بانسوں پر زعفرانی جھنڈوں سے گھیرا بنا دیا گیا۔ بھجن کیرتن شروع ہو گئے، دو تین بھگتوں نے وہیں ڈیرا ڈال لیا۔

تین ماہ گزر گئے۔ نہ کورونا گیا اور نہ لاک ڈاؤن کھلا لیکن سوامی جی کی سمادھی کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ انتظامیہ کے افسران اور ڈاکٹروں کی موجودگی میں مقررہ وقت پر سوامی جی کو سمادھی سے نکال کر ان کے ککش میں پہنچا دیا گیا۔ سانسیں بحال ہو چکی تھیں ڈاکٹر جانچ میں جٹ گئے۔ ان میں ایک ڈاکٹر Asymtamatic کورونا پازیٹو بھی تھا جو قریب سے ان کی سانسوں اور دل کی دھڑکن پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

تیسرے دن سوامی جی کے پران پکھیرو اڑ گئے۔

ہوم کورنٹائن

وشال اپنے بچوں کو ان کے ننھیال سے لینے جا ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر پیغام کا اشارہ موصول ہوا اور پیغام پڑھ کر تو لگا جیسے کسی نے اس کے اعصاب کی ساری طاقتیں سلب کر لی ہوں۔ پاپا کی کورونا رپورٹ پازیٹو تھی۔ انہیں دو تین دن سے بخار تھا اس لیے اس نے احتیاطاً کورونا کا ٹیسٹ کروالیا تھا۔ رپورٹ دیکھ کر تو ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے لیکن دماغ نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پاپا اپنی خواب گاہ میں شاید سو رہے تھے۔ اس نے جلدی جلدی ان کا ضروری سامان سمیٹا اور تیسری منزل پر بنے 6x6 کے سرونٹ کواٹر میں پہنچا دیا۔ پاپا کو جگا کر صورت حال بتائی تو وہ فق سے رہ گئے۔ انھوں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا ''کیا اسپتال لے جا رہے ہو؟''

''نہیں پاپا سرکاری اور آرمی اسپتالوں میں جگہ نہیں ہے اور پرائیویٹ اسپتال بہت مہنگے ہیں۔ آپ گھر میں ہی آرام سے کورونٹائن میں رہیں گے۔'' وشال نے انھیں سرونٹ کواٹر میں پہنچایا تو اسے لگا ان کے پلکوں پر ایک ستارہ سا جھلملا رہا تھا۔

''بچوں کا خیال رکھنا''۔

اس نے پانی کا کین اور کچھ کھانے کا سامان ایک ڈبے میں ڈال کر کمرے

کے باہر چوکھٹ پر رکھ دیا۔ گھر کو سینا ٹائز کیا، غسل کیا کتے کے کھانے کا پیالہ ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر اسے آرام سے بٹھایا۔

گاڑی باہر نکالتے ہوئے اس کی نظر دومنزلہ شاندار عمارت کے پھاٹک پر لگی پیتل کی نیم پلیٹ پر پڑی جو دھوپ کی کرنوں میں کندن بنی ہوئی تھی۔ ''بریگیڈیر مہندر پرتاپ سنگھ''۔

خراج عقیدت

عبید اسپورٹ اکیڈمی سے ٹینس کی پریکٹس کر کے واپس آیا تو حمیرا چائے پر
اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سیب کے کچھ ٹکڑے منہ میں ٹھونستے
ہوئے اپنا بیگ ڈائننگ ٹیبل پر رکھا۔ ''ممی آج بہت ہوم ورک ملا ہے ناشتے کا بھی
وقت نہیں ہے میرے پاس'' حمیرا نے پیار سے اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنورا
اور چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے کہا'' پہلے یہ سیب ختم کرو اور چائے پیو اور فکر مت
کرو۔ مغرب تک تمہارا سب کام ختم ہو جائے گا۔ میں ہوں نا۔'' حمیرا نے مسکراتے
ہوئے ناشتے کے برتن بڑھائے اور بیگ سے کتابیں نکالتے ہوئے عبید کی مدد میں
مصروف ہو گئی۔ مغرب تک ہوم ورک ختم ہوا تو حمیرا نے یاد دلایا'' عبید کل ٹیچرس ڈے
ہے تم نے اپنے اساتذہ کے لیے کارڈ بنائے کہ نہیں''؟ '' جی ممی۔ آج ہمارے آرٹس سر
نے سبھی ٹیچرس کے لیے کارڈ بنوائے اور انھوں نے کہا'' ایک سب سے بڑا کارڈ اُس
ٹیچر کے لیے بناؤ جس کو تم سب سے زیادہ پسند کرتے ہو۔ بس وہی کارڈ بچا ہے۔
مغرب کے بعد بناؤں گا۔ لیکن ممی ہم ٹیچر کو کارڈس کیوں دیتے ہیں''؟

حمیرا نے جواب دیا'' بیٹا استاد کا ہماری زندگی میں والدین کے بعد سب سے

بڑا درجہ ہے۔ استاد ہمیں نہ صرف علم کی دولت سے بہرہ ور کرتے ہیں بلکہ ڈسپلن اور بہترین آداب زندگی سکھا کر آدمی سے انسان بناتے ہیں۔"

اس وقت رضوان صاحب بھی آفس سے واپس آئے۔ حمیرا باورچی خانہ میں جانے لگی تو عبید نے یاد دلایا۔ "ممی پرسوں سائنس کا پروجیکٹ جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔ سب بچے بازار سے دو ہزار میں بنے بنائے ماڈل خرید لائے ہیں۔ کئی بچوں نے تو جمع بھی کروا دیئے ہیں کل شام کو آپ بھی خرید لایئے گا۔"

حمیرا نے جواب دیا "تم فکر نہ کرو، کل رات تک تمہارا پروجیکٹ آجائے گا۔"

اگلے دن اسکول میں یوم اساتذہ کی خصوصی اسمبلی تھی۔ کئی بچوں نے اس موضوع پر اپنی تقریریں پڑھ کر سنائی۔ آج وقت کم تھا اور صرف چار پیریڈ کی پڑھائی تھی۔ پہلا گھنٹہ انگریزی کا تھا۔ ٹیچر آئے، کتابیں کھلوائیں، دو تین بچوں سے سبق کی ریڈنگ کروائی اور سبق کی تمام مشقیں ہوم ورک میں کر کے لانے کا حکم دیا۔ گھنٹہ ختم ہوگیا۔ دوسرا پیریڈ ریاضی کا تھا۔ آج انہیں آشاریہ کی ضرب اور تقسیم سیکھنی تھی۔ ٹیچر نے بلیک بورڈ پر ایک سوال حل کر کے دکھایا پھر کلاس کے سب سے ذہین دو بچوں نے دو سوال حل کیے۔ ان کی خوب تعریف ہوئی اور باقی چوبیس سوال گھر سے کر کے لانے کو دیے دئے گئے۔

تیسرا گھنٹہ سائنس کا تھا۔ بہت سے بچوں نے آج بازار سے خریدے ہوئے پروجیکٹ کے ماڈل جمع کروائے۔ ٹیچر سب جانتے تھے لیکن انہوں نے خوب تعریف کی اور بچوں نے یقین دلایا کہ انتقال توانائی کا یہ ماڈل انھوں نے اپنے والد کی مدد سے بنایا ہے۔ جن بچوں نے ابھی تک جمع نہیں کروایا تھا انہیں ٹیچر نے تاکید کی کہ وہ پرسوں تک ہر حال میں جمع کروادیں ورنہ سائنس میں فیل ہوجائیں گے۔ گھنٹہ تمام

ہوا۔ تیسرا پیریڈ سنسکرت کا تھا۔ میڈم نے بچوں سے سنسکرت کے قواعد کی گردان سنی اور ''ادھیا پک دسوس'' پر دس لائنوں کا لیکھ لکھ کر لانے کو کہا۔

چھٹی کے بعد عبید گھر پہنچا تو دیکھا کہ حمیرا سائنس کے پروجیکٹ کا ماڈل تیار کر چکی تھی اور آخری ٹچ دے رہی تھی۔ عبید نے سب سے بڑا کارڈ اور گل دستہ بھی ممی کے قدموں میں رکھ دیا۔

پابندِ شریعہ

رات نو بجے کے قریب فرید نے گھر میں قدم رکھا بے حد تھکا ہوا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ لابی میں زماں صاحب اور قدسیہ بیگم بیٹھے اس سے بھی زیادہ فکر مند نظر آ رہے تھے۔ ''کیا ہوا ابا؟ آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' فرید نے پوچھا۔

''پہلے تم بتاؤ کیا رہا''؟ زماں صاحب نے الٹا سوال کر دیا۔

''ابا تاج ہوٹل میں دو دن کے لیے پندرہ کمروں کا کرایہ دس لاکھ ہے۔ کھانا پینا الگ! کیسے انتظام ہوگا۔''

''یہاں دوسری مصیبت منتظر ہے۔'' زماں صاحب بولے ''ثمن کے سسر کا فون آیا تھا، کہہ رہے تھے کہ اگر آپ اپنی بیٹی کو کچھ دینا چاہیں تو سامان کا ٹرک بارات کی روانگی سے پہلے پہنچ جائے تا کہ ہم حجلہ عروسی تیار کر کے ہی نکلیں۔

فرید بھنا گیا ''لیکن انہوں نے تو کہا تھا کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ آپ صرف بارات کے ٹھہرنے کا انتظام تاج میں کر دیں کیونکہ بارات میں بڑے بڑے لوگ آ رہے ہیں۔''

''کیا کریں بیٹا'' قدسیہ بیگم دھیرے سے بولیں ''بیٹی والے کا سر تو ہمیشہ جھکا

ہی رہتا ہے۔''

''اور کیجئے امیروں میں رشتہ''! فرید زیر لب بڑبڑایا، تب ہی اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ''ابا آپ نے حق مہر کی بات کی ان سے؟''

''ہاں بیٹا! ان کا کہنا ہے کہ مہر تو فاطمی ہی بندھے گا۔ ''ٹھیک ہے ابا۔ ان سے کہہ دیں جہیز کا ٹرک وقت پر پہنچ جائے گا۔''

''لیکن ٹرک کے ساتھ کون جائے گا۔ تمہارے سر تو یہاں سو کام ہیں۔ اور سامان ! ہم نے تو سوائے زیور کپڑوں کے کچھ کیا ہی نہیں! ''زماں صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''وہی میرا غریب لیکن شریف دوست ندیم جائے گا۔

اور ابا آجکل ہر چیز بازار میں مل جاتی ہے۔ فکر نہ کریں'' فرید فوراً ہی باہر نکل گیا۔

دو دن بعد جہیز کا ٹرک لڑکے والوں کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دولہا کے باپ، بھائی، بہنوئی، چچا، تایا، ماموں سب نے نہایت اشتیاق کے ساتھ ٹرک کا تالا کھلوایا۔

ٹرک میں دو مٹی کے گھڑے، ایک چکی اور یک چمڑے کا گدا سجے ہوئے تھے۔ ایک شاک کی کیفیت میں سب نے ایک ساتھ پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

سامان کے ساتھ آئے نوجوان نے نہایت شائستگی سے جواب دیا۔ ''یہ فاطمی جہیز ہے جناب۔''

شیشے کی دیوار

بادی النظر میں شیشے کی دیواریں بڑی خوبصورت لگتی ہیں۔ صاف شفاف، بچی جو ذہن ونظر پر کوئی پابندی نہیں لگاتیں، لیکن جب قریب جاؤ تو پتہ چلتا ہے کہ شیشے کی دیواریں تو بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ جب تک حائل رہتی ہیں، لمس اور سماعت کو مجروح رکھتی ہیں اور جب ٹوٹتی ہیں تو ہنگامہ برپا کردیتی ہیں۔ ان کی کرچیاں بڑی دور تک جاتی ہیں۔ نہ صرف انگلیوں کو فگار کردیتی ہیں بلکہ قلب اور روح کو بھی لہولہان کردیتی ہیں۔

آٹھ سال کا وہ چھوٹا سا غبارے بیچنے والا لڑکا جو پچھلے کئی دنوں سے شیشے کے شوکیس میں سجی حسین وجمیل گڑیا کے عشق میں گرفتار تھا، ہر روز جب دکان کھلتی، وہ اس کا دیدار کرنے پہنچ جاتا۔ گڑیا کو چھونے کی شدید خواہش ہر روز شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر مایوس لوٹ آتی۔ وہ جب بھی اسے چھونے کی کوشش میں ہاتھ بڑھاتا، شیشے کی دیوار لمس کی آرزو کے درمیان حائل ہوجاتی۔

ایک دن اس کا عشق بے محابہ ہوگیا۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور شیشے کی دیوار پر دے مارا۔ بڑی زور کا چھناکا ہوا۔ اپنا زخمی ہاتھ گڑیا کو چھونے کے لیے بڑھایا ہی تھا

کہ خون کی ایک بوند گڑیا کے دودھ جیسے پاؤں پر ٹپکی لیکن چھونے سے پہلے لوگ دوڑ پڑے۔ دوکان کے مالک نے اس کے چہرے کو طمانچوں سے لال کرتے ہوئے پاس کھڑے پولیس والے کے حوالے کر دیا۔ اور ایک معصوم خواہش کو مجرمانہ گناہ کی راہ پر بھٹکنے کے لیے چلڈرن ریمانڈ ہوم بھیج دیا گیا۔

ہیپی ٹیچرس ڈے

آج برلا مہاودیالیہ نامی اسکول کا سالانہ جلسہ تھا۔ میں وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئی تھی اور صفِ اول میں اپنی نشست گاہ پر بیٹھی اس شاندار آڈیٹوریم کو دیکھ کر فخر محسوس کر رہی تھی کہ میں تیس سال اس درس گاہ سے جڑی رہی جس میں بڑے بڑے لوگ اپنے بچوں کے داخلے کے لیے تمنائی رہتے تھے۔ مجھے آج بھی وہ آٹھ سالہ پیارا سا غریب بچہ یاد ہے، جس کی ماں اسکول کے باہر پھل بیچتی تھی۔ ایک دن جب میں پھل خریدنے کے لیے رکی تو اس نے بڑی حسرت سے مجھ سے پوچھا تھا ''میڈم کیا میں اس اسکول میں کبھی نہیں پڑھ سکوں گا''؟

میرا دل دکھ گیا لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔ میں بھی تو یہاں ملازم ہی تھی۔ میں نے اس کی ماں کو راضی کر کے اس کا داخلہ پاس کے سرکاری اسکول میں کروا دیا۔ امت نام کے اس بچے کی ماں دوپہر کو ہماری سوسائٹی کے گھروں میں جھاڑو برتن کرتی تھی، پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ اس کی ماں انگوری امت کو میری پڑوسن مسز ماتھر کے یہاں اس وعدے پر چھوڑ کر گاؤں چلی گئی کہ اس کا اسکول نہ چھوٹے۔

دیر رات کو ہمیشہ وہ ان کی بالکونی میں لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ہوم ورک کرتا

نظر آتا اور روز مسز ماتھر چھڑی سے اس کی پٹائی کرتی کہ وہ صبح دیر سے اٹھتا ہے۔ایک دن میں نے دخل دینا چاہا تو وہ بدتمیزی سے بولی ''مائنڈ یور اون بزنس'' پھر اگلے ہی ماہ میں نے وہ کرائے کا مکان چھوڑ دیا اور اپنے فلیٹ میں شفٹ ہوگئی۔

خیالوں کی دنیا سے نکل کر میں چونکی۔مہمان خصوصی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ امت کمار میرے پاؤں چھو رہے تھے۔

ناممکنات کا امکان

نگار خانے کے افتتاح کی ساعتیں نزدیک آرہی تھیں لیکن اب تک مجسمہ ساز اپنا وہ نادر مجسمہ تخلیق نہیں کر پایا تھا جس کی تنصیب کے لیے نگار خانے کے دروازے پر نور کی شعاؤں سے روشن سنگ مرمر کا چبوترہ اور چھتری بنائی گئی تھی۔ دیکھنے والوں کے لبوں پر تحیر اور اضطراب کی سرگوشیاں تھیں۔ خدمت گار حیران تھے کہ یہ کیسی تخلیق ہے کہ فن کار کو غور و فکر میں اتنا وقت لگ رہا ہے، ورنہ سارا نگار خانہ تو محض چھ دن میں ہی عالم وجود میں آ گیا تھا۔ ہر پل انہیں ایک نئی قسم کی مٹی کی تلاش اور بازیافت پر بھیجا جا رہا تھا اور وہ تلاش بسیار کے ساتھ سرگرداں تھے۔ نگار خانے کے باہر انواع واقسام کی مٹیوں کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں، حسن کی مٹی، دلکشی و دلآویزی کی مٹی، نزاکت کی مٹی، صبر و برداشت اور ایثار و قربانی کی مٹی، بے نفسی و غرور و فخر کی مٹی، خود فریبی اور خود ترسی کی مٹی، فنا و بقا کی مٹی، جلال و جمال کی مٹی، عظمت و مرتبت کی مٹی، رحم و ہمدردی کی مٹی، سخت مٹی، نرم مٹی۔

نصف شب مجسمہ ساز نگار خانے سے باہر نکلا، خدمت گار ہاتھ باندھے منتظر کھڑے تھے۔ اس نے ایک نظر ان ڈھیریوں پر ڈالی اور حکم ہوا:

''ان سب مٹیوں کو ملا دو اور انہیں زم زم، فرات، دجلہ، نیل، تھیمس اور گنگ وجمن کے مقدس پانیوں سے گوندھ دو۔''

خدمت گاروں نے باادب عرض کیا۔

''اے عظیم فن کار آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ اتنے مختلف النوع اجزاء کا یکجا ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ مجسمہ تو بکھر جائے گا کیونکہ یہ مجموعہ اضداد اس کائنات میں سما ہی نہیں سکتا۔''

مجسمہ ساز کی پُرتحکم آواز گونجی ''حکم کی تعمیل ہو۔ فن کار میں ہوں یا تم! تخلیق کی قدرت مجھے حاصل ہے یا تمہیں!''

خادموں نے سرِ تسلیم خم کیا اور حکم کی تعمیل میں جٹ گئے۔

جب خام مال تیار ہو گیا تو حکم ہوا۔ ''اب تم سب جا سکتے ہو۔''

افتتاح کی صبح حاضرین نے حیرت و مسرت، سرشاری و طمانیت کے عالم میں دیکھا کہ نگار خانے کے دروازے پر ایک شاہکار مجسمہ ایستادہ تھا جس کو چاند کی کرنوں، ستاروں کی دمک، سمندر کی گہرائی، پربتوں کی اونچائی، آبشاروں کے نغموں اور پھولوں کی خوشبو کے تیل میں بسا کر نکھارا اور سنوارا گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر تخلیق کے قلم کو کائنات کی چاندی کے گھول میں ڈبو کر 'ماں' تحریر کیا گیا تھا۔ اور جواہرات سے مرصع طشت میں جنت الفردوس کو سجا کر اس کے قدموں تلے رکھ دیا گیا تھا۔

حاضرین فرطِ عقیدت اور اعتراف عظمت میں سرنگوں ہو گئے۔

دوسرا کنس

راج محل میں اپنے شین ککش میں ننگی تلوار لئے بیتابی سے ٹہلتے ہوئے کنس کو کاراواس کے دوار پال نے اطلاع دی ''مہاراج کی جے ہو وسودیو اور دیوکی کے یہاں چھٹا پتر پدھارا ہے'' کنس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اسی حالت میں کاراواس پہنچا۔ اسے دیکھ کر دیوکی کا چہرہ ڈر سے سفید ہو گیا۔ کنس نے بالک کو اٹھایا، اس کی من موہنی صورت دیکھ کر کنس کی آنکھوں میں ایک پل کے لئے دیا کی جوت جاگی، اگلے ہی پل اس کی جگہ غیض وغضب نے لے لی۔ اس نے بچے کو اٹھا کر کاراواس کی دیوار پر دے مارا جہاں پہلے ہی پانچ نشان بنے ہوئے تھے۔ وسودیو نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوکی بیہوش ہو گئی۔۔۔۔۔۔ منظر بدلا۔۔ جنتا فلیٹ میں کمرے کے باہر کوریڈور میں، ہاتھ میں ڈنڈا لئے، امید اور ناامیدی کی حالت میں ٹہلتے ہوئے اس شخص کو دائی نے اطلاع دی ''تیرے گھر چھٹی بار لکشمی آئی ہے''۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ دائی کے پیچھے کمرے میں داخل ہو کر اس نے ڈر سے تھر تھر کانپتی دیوکی کو قہر کی نظر سے دیکھا اور بچی کو اٹھا لیا۔ بچی کی من موہنی صورت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دیا اور موہ کی کوئی کرن نہیں جاگی۔ غیض وغضب کے عالم میں اس نے بچی کو دیوار سے دے مارا جہاں پہلے ہی پانچ نشان تھے لیکن اس بار قاتل کنس نہیں خود وسودیو تھا۔

ساحرہ

برٹش ایئرویز کا طیارہ اپنی متعین بلندی پر پہنچ کر سبک روی سے پرواز بھرنے لگا تو سہ نشستی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تینوں غیر ملکیوں نے اپنے اخبار تہہ کیے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ گفتگو کا چرخہ چل پڑا۔ ان کا تعلق یورپ کے مختلف ممالک سے تھا لیکن منزل ایک ہی تھی، کثیر الثقافتی اور کثیر السانی ملک ہندوستان۔ تینوں اپنے اپنے ملک کے نامور قلم کار تھے اور سیاحت ان کے رخش قلم کو مہمیز کرنے کا باعث تھی۔ دوران پرواز انھوں نے ہندوستان کی سیاحت میں ہم سفر رہنے کا فیصلہ کیا۔

ایک ماہ کی سیاحت میں انھوں نے بہت سے علاقے، متعدد تہذیبیں و معاشرتیں دیکھیں۔ بہت سی زبانوں کو سنا اور پڑھا لیکن تشنگی دور نہیں ہوئی۔

ان گنت میدانوں، پہاڑوں، ساحلوں اور جنگلوں سے گذرتے ہوئے سفر کے آخری پڑاؤ میں تھکے مسافر ایک سبزہ زار میں پہنچے جہاں ایک حسین و جمیل دوشیزہ نے روپہلی قلم جیسی نازک انگلیوں کو چاندی سی پیشانی تک لے جا کر ان کا استقبال کیا۔ کیا حسن تھا، کیا تمکنت تھی، کیا ادا تھی! رشک غزال آنکھوں کی سپیدی، سیاہی اور سرخی میں مے دو آتشہ کا خمار تھا۔ ہر ادا میں تہذیب تھی، سلیقہ تھا۔ جب وہ لب کشا ہوئی تو ان

فرنگیوں کو لگا جیسے جل ترنگ بج اٹھا ہو، چاندی کے گھنگھرو گنگنائے ہوں، جیسے خالص شہد قطرہ قطرہ کانوں میں گھل گیا ہو، جیسے الفاظ سحر پھونک رہے ہوں۔

ایک نے پوچھا ''اے شیریں دہن حسینہ تمہارا نام کیا ہے''؟

نازنین نے حجاب آلود نظریں اٹھائیں اور گلاب کی پنکھڑیوں کو جنبش ہوئی ''ناچیز کو اردو کہتے ہیں''۔

دوسرے نے حیرت سے پوچھا ''اے سیمیں بدن تم اس گلستاں میں تنہا کیوں ہو؟''

اس نے جواب دیا ''میری دلکشی اور ہر دلعزیزی سے خوفزدہ ہو کر میری سگی بہن نے دشمنوں سے ہاتھ ملا لیا اور احساس کمتری کا شکار میرے اپنوں نے مجھے در بدر کر دیا۔''

بصیرت

کچھ سال پہلے میری ایک کمزور طبقے کی پڑوسن اپنے دس بارہ سالہ بیٹے کو میرے پاس لائی ''میڈم جی، اسے کچھ اللہ رسول کا نام سکھا دو۔ برسوں سے سرکاری اسکول میں نام لکھایا ہے، شام کو مدرسے بھی بھیجتی ہوں۔ نہ یہاں کچھ سیکھتا ہے نہ وہاں۔ثواب ہوگا آپ کو۔''

سہ پہر کو وہ اپنا کپڑے کا بیگ اٹھائے چلا آیا جس میں ایک شکستہ سا یسّرنا القرآن تھا، اردو میڈیم کے ابتدائی درجے کی میلی سی کتابیں، کچھ پینسلیں اور دو نوٹ بک پڑی تھیں۔ پڑھوانے کی کوشش کی تو کالا اکشر بھینس برابر۔اس جیسا غبی بچہ شاید ہی زندگی میں ملا ہو۔ دانتوں پسینہ آ گیا۔ برسوں میں وہ صرف نماز یاد کر پایا اور اردو کے کچھ الفاظ اٹک اٹک کر پڑھنے لگا۔

اب وہ پندرہ کا ہو چکا تھا، باپ کے ساتھ کام پر بھی جاتا تھا لیکن شام کو کچھ دیر کے لیے اپنا آثار قدیمہ جھولا اٹھائے چلا آتا۔

ایک دن اس نے مجھ سے میرا پرانا اسمارٹ فون مانگا۔ میں نے نیا سم ڈلوا کر دے دیا۔ یار دوستوں کی مہربانی سے فیس بک پر تصاویر اور پیغامات فارورڈ کرنے میں

ماہر ہوگیا۔ اس کا سب سے بڑا شوق!

گزشتہ عید پر سلام کرنے آیا ''میڈم جی میرا فیس بک نہیں چل رہا۔ دیکھ لیں ذرا''

میں نے نظر ڈالی۔ چیٹ باکس رمضان اور عید کے ہزاروں پیغامات اور اسٹیکرز سے بھرا پڑا تھا۔ میں نے بتایا کہ یہ بھاری ہوگیا ہے۔ اسے صاف کرلو۔ یہ دو بٹن ہیں۔ ایک کو چھوکر جو چاہو مٹادو اور دوسرے پر انگلی رکھو گے تو سب مٹ جائے گا۔

ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے سب ڈیلیٹ کردیا۔

میں نے کہا ''ارے کچھ اچھے طغرے اور حدیثیں تو محفوظ کرلی ہوتیں''۔

وہ بولا ''میڈم جی حدیث پڑھنی تو ہمیں آتی نہیں، آپ جانو اور نبی کا نام جو طغرے پر لکھا ہے نا، ہم جانتے ہیں ان کو۔ ہم ان کے ہیں اور وہ ہمارے ہیں۔ ان کا نام یہاں لکھا ہے۔''

اس نے انگوٹھے سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے لیے ہمیں کونو فیس بک کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ موبائل تھام کر چلتا بنا اور میں سوچتی رہی کہ کیا اس سے بڑا عشق، اس سے بڑا علم اور اس سے بڑا ایمان کہیں ہے!!!۔

انسانیت کی جستجو

شہر میں کورونا کی وبا نے قہر مچا رکھا تھا۔ سرکار کی مشینری پوری طرح چرمرا گئی تھی۔ اسپتالوں میں بیڈ نہیں تھے، آکسیجن نہیں تھی، بازار سے دوائیاں غائب تھیں۔ ہر گھر میں بیماری تھی، لوگ آکسیجن کی کمی سے دم توڑ رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو اپنے کمرے تک محدود کر رکھا تھا۔ جو کچھ دال چاول گھر میں تھا، ابال کر کھالیتا اور دن بھر سوشل میڈیا سے ملی خبریں سن کر دہلا کرتا۔ لیکن اس رات جب میرے جگری دوست اویناش کا فون آیا کہ ماں کی حالت خراب ہے، ان کا آکسیجن لیول گر رہا ہے، تو میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔ ہم نے آنٹی کو آلٹو کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور نکل گئے۔ رات دو بجے سے صبح دس بجے تک ہم نے دس اسپتالوں کی خاک چھانی۔ کہیں بیڈ نہیں تھا۔ ایک جگہ بیڈ تھا لیکن آکسیجن نہیں تھی۔ پچھلی سیٹ سے آنٹی کی بے ترتیب تکلیف دہ سانسوں کی آوازیں ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہی تھیں۔

اویناش کا رو رو کر برا حال تھا۔ میں کار ڈرائیو کر رہا تھا، تب ہی ہم ایک گرودوارے کے سامنے سے گذرے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بہت سے سردار بھائی سڑک کے کنارے آکسیجن کا سلنڈر لئے اپنی اپنی گاڑیوں میں پڑے لب دم

مریضوں کی جان بچا رہے تھے۔ میں نے بھی ایک سلنڈر کے پاس گاڑی روکی۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔ آنٹی کا آکسیجن لیول اس وقت 55 تھا۔ اس رحمت کے فرشتے نے انہیں زندگی کی نوید سنائی۔ تین گھنٹے تک آکسیجن دینے کے بعد آنٹی خطرے سے باہر نکل آئیں۔ اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ ان گنت مریضوں کو گورو دوارے والوں نے حسب ضرورت آکسیجن دے کر رخصت کیا۔ میں سرداروں کی اس انسانیت نوازی سے بہت متاثر ہوا۔ شام کو ضروری دواؤں کے ساتھ اویناش اور آنٹی کو گھر چھوڑ کر میں کمرے پر آیا۔ تکان سے برا حال تھا۔ فوراً ہی سو گیا۔ صبح اویناش کا فون آیا۔

''ممی بہتر ہیں لیکن مجھے بخار آ گیا ہے۔ کچھ کھانے کا انتظام کر سکتا ہے بھائی؟''

میں اضطرابی حالت میں فیس بک پر انگلی گھما رہا تھا تب ہی میری نظر ایک پوسٹ پر پڑی۔ دلی گورودوارا پربندھک کمیٹی والے کورونا کے ہوم کورنٹائن مریضوں کو کھانے کی ہوم ڈیلیوری کر رہے تھے۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے دیئے گئے نمبروں میں اپنے علاقے کے نمبر پر کال کر کے اویناش کے گھر کا پتہ لکھوا دیا اور دو گھنٹے کے اندر ہی کھانا پہنچ گیا۔

میرا رُوم رُوم سرداروں کی انسانیت نوازی اور سکھ مذہب کا قائل ہو گیا۔ اگلے دن میں دلی کے ایک مرکزی گرودوارے میں پہنچا۔ بیسوں لوگ کھانا پکانے، پیک کرنے اور بھجوانے میں مصروف تھے۔ ایک لمبی سی ڈاڑھی والے معمر سردار جی نگرانی کر رہے تھے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے ان لوگوں کے جذبے اور خدمات کی بہت تعریف کی پھر جھجکتے ہوئے کہا۔

''سردار جی میں آپ کے دھرم سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ چاہتا ہوں کہ سکھ دھرم اپنا لوں۔''

بزرگ نے مجھے غور سے دیکھا پھر پوچھا ''بٹیا تیرا نام کیا ہے؟''

میں نے کہا ''امام الدین''۔

وہ کچھ رک کے پھر بولے۔ ''بیٹا تجھے معلوم ہے جب گرو نانک جی سکھ دھرم کی استھاپنا کر رہے تھے تو انھوں نے سب دھرموں کو پڑھا، سب جگہ گھومے، مکہ مدینہ بھی گئے اور سب سے زیادہ جس دھرم نے انہیں متاثر کیا وہ اسلام تھا۔ محمد صاحبؐ کے جیون سے انھوں نے سبق لیا۔ اسی لیے ہمارے دھرم اور اسلام میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ بیٹا تو تو اس دھرم کا مشعل بردار ہے جس نے ساری دنیا کو روشنی دی اور تو روشنی کو کہیں اور تلاش کر رہا ہے!!!''

اندھیر نگری

سعدی نے نہایت ہی پریشانی کے عالم میں شاہین کے کمرے کے دروازے پر پیہم دستک دی۔ شاہین لیپ ٹاپ پر آفس کا کام پورا کر رہی تھی، بھائی کی مخصوص لیکن پریشان سی دستک سن کر فوراً ہی دروازہ کھول دیا، سعدی کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے، آنکھوں میں اضطراب تھا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شاہین جلدی چلو۔ سواتی گھر سے بھاگ کر یہاں آنے والی تھی۔ میں نے بمشکل اسے راضی کیا ہے کہ وہ بدھا پارک میں میرا انتظار کرے۔ اگر وہ گھر پہنچ گئی تو غضب ہو جائے گا۔ تمہاری سہیلی ہے۔ تم اسے سمجھاؤ۔''

شاہین کا رنگ بھی ممکنہ پریشانی کے تصور سے فق ہو گیا۔ اس نے بعجلت کرسی کی پشت پر پڑا ہوا دوپٹہ شانوں پر ڈالا اور انگلیوں سے بالوں کو درست کرتی ہوئی نکل آئی۔

سعدی نے امی کے کمرے میں جھانکا۔ ابو سو رہے تھے۔ امی ظہر کی نماز کی تیاری میں تھیں۔

''امی ہم لوگ ذرا باہر جا رہے ہیں۔ جلدی آ جائیں گے۔'' سعدی بائیک دوڑاتا ہوا پارک پہنچا۔ سواتی کندھے پر بیگ ٹانگے ہوئے ٹہل رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر

بے تابانہ ان کی طرف بڑھی۔

سعدی نے کہا ''سواتی یہ کیا بچپن ہے۔ جو قدم تم نے اٹھایا ہے، اس کا انجام بھی جانتی ہو! تمہاری تلاش سب سے پہلے ہمارے ہی گھر سے شروع ہوگی۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ میرے پورے خاندان کو اغوا کے الزام میں جیل میں ڈال سکتے ہیں۔ ہمارے گھر پر غنڈوں سے حملہ کرواسکتے ہیں۔ میری بہن کی عزت خطرے میں پڑسکتی ہے۔ تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔''

''الیکشن کا زمانہ ہے۔ تمہارے پاپا کچھ بھی کرسکتے ہیں، کیونکہ بات صرف مذہب کی نہیں بلکہ ووٹ بینک کی بھی ہے'' شاہین نے سمجھایا۔

''تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے پاپا میرا رشتہ چودھری رتن لال کے آوارہ بیٹے سے کرنے جارہے ہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں مسلمان ہوجاؤں گی۔ تمہارے ماں باپ کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ آج رکشا بندھن ہے، ممی، پاپا اور دیدی کے ساتھ ماما کے گھر گئی ہیں راکھی باندھنے، گھر میں تالا لگا کر۔ میں بڑی مشکل سے نکل کر آئی ہوں۔'' سواتی کی آنکھیں نیر برسانے لگیں۔

''تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔ دو خاندانوں کی عزت سے نہ کھیلو۔ صرف ایک ہفتہ میں سب انتظام کر کے خود تمہیں لے جاؤں گا۔''

بمشکل سواتی کو رخصت کر کے وہ دونوں گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ آسمان پر اترنے والی شام کی سرمئی چادر کے کنارے خوں آشام ہورہے تھے۔ شاہین نے کہا ''بھیا ذرا تیز چلیے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

وہ گھر کا موڑ مڑے ہی تھے کہ سڑک پر چار پانچ بھینسے لاٹھیاں لیے کھڑے نظر آئے۔ سعدی کو اتنی بھی مہلت نہیں ملی کہ بائیک گھما لیتا۔ اسے کھینچ کے اتار لیا گیا اور

لاٹھیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ سعدی درد سے تڑپتا رہا، شاہین ہسٹریائی انداز میں چلاتی رہی اور گاڑیاں زناٹے سے گذرتی رہیں۔

کالو دادا نے فون لگایا۔ ''سیٹھ جس لڑکے کا فوٹو تم نے بھیجا تھا، اسے تو میرے پٹھے ٹھکانے لگا رہے ہیں۔ تمہاری بیٹی کا کیا کریں۔ میرے کو دیر ہو رہی ہے۔ بہن سے راکھی بندھوانے جانا ہے۔''

اگلے ہی لمحے ریوالور سے شعلہ نکلا اور ساتھ ہی سعدی کے سر پر لاٹھی کا آخری وار پڑا۔ دونوں بھائی بہن کی آوازیں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔

دور مندر میں کرشن اور سبھدرا کی آرتی ہو رہی تھی۔

گاندھی گیری

جب میں آٹھویں درجے کا طالبعلم تھا تو ہماری کلاس میں دو طلبا سب سے زیادہ ذہین، ہونہار اور پڑھائی میں تیز تھے۔ایک نیلیش اور ایک میں۔کبھی میں اول آتا تو کبھی وہ۔ ہمارے درمیان حریفانہ کشاکش لگاتار چلتی رہتی تھی اور نوبت ہاتھاپائی تک پہنچ جاتی تھی۔ میں جسمانی طور پر زیادہ طاقتور تھا اس لیے نیلیش ہمیشہ مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے سے کتراتا تھا۔تب ہی گاندھی جی پر مشہور فلم ''لگے رہو منا بھائی'' ریلیز ہوئی۔ میں نے دیکھی تو میری دنیا ہی بدل گئی۔ ہر وقت ستیہ اور اہنسا کا پاٹھ رٹتا رہتا اور ہر طرف گاندھی جی کھڑے نظر آتے۔ نیلیش نے یہ صورت حال دیکھی تو اس کی ہمت بڑھ گئی۔اب وہ جان جان کر مجھے پریشان کرنے لگا۔لیکن میرے اوپر تو اہنسا سوار تھی میں بیگ میں پھول رکھ کر لے جاتا اور اس کی ہر زیادتی پر اسے پھول پیش کر دیتا۔اس کی بدتمیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔نیلیش نے پہلے تو میرا ٹفن باکس نکال لیا اور دوستوں کے ساتھ صاف کر دیا۔ مجھے بھوکا رہنا پڑا۔جی چاہا ایک ہاتھ ماروں لیکن باپو کھڑے

نظر آئے۔ پھر میرا اسائمنٹ چرا کر پھاڑ دیا اور مجھے ٹیچر کی ڈانٹ کھانی پڑی۔ لیکن میرے اوپر گاندھی گیری سوار تھی۔ کھیل کے گھنٹے میں نیچے میدان میں جاتے ہوئے اس نے مجھے ایسی ٹنگڑی ماری کہ میں منہ کے بل گرا۔ دانت ہونٹ میں گڑھ گئے اور منہ خونم خون ہو گیا۔ میں جیب میں پھول تلاش کر رہی رہا تھا کہ میری نظر سامنے پڑی۔ باپو کے ہاتھ میں ہری جھنڈی تھی جس پر لکھا تھا "ظلم سہنا بھی پاپ ہے۔"

گرو دکشنا

طلب علم میں بھٹکتے ہوئے اس شہری لڑکے کو گرو جی نے اپنے آشرم میں پناہ دی اور اسے وہ سب سکھایا جس کی طلب لے کر وہ گرو جی کے پاس آیا تھا۔ بارہ برس آشرم میں گزارنے کے بعد آج رخصت کا وقت آ گیا تھا اور وہ گرو جی کی کٹیا کے باہر ان کے آشیرواد کا منتظر تھا۔ گرو جی نے کٹیا سے باہر قدم نکالا ان کا ماتھا ایک انوکھے نور سے چمک رہا تھا۔ وہ مسکرائے اور پوچھا "جانے کی تیاری ہوگئی؟"

طالب علم نے سر جھکا کر کہا "ہاں گرو جی آپ نے گیان کے سمندر میں مجھے شرابور کر دیا۔ گیان، کلا، جاگروکتا، آتم سمان، ایشور کی پہچان اور خود اپنی پہچان کروائی، راج نیتی، پریشرم اور آہنسا کے ہتھیاروں سے لیس کر دیا۔ آپ نے میری بدھی، سمجھ اور یوگیتا کو چمکا دیا۔ اب میں جیون کی رنگ بھومی میں اترنے کو تیار ہوں۔ گیان سے میرا سینہ پھٹ رہا ہے اور میں اسے بانٹنا چاہتا ہوں۔

اب گرو دکشنا دینے کا وقت آ گیا ہے۔ اکلویہ نے اپنے گرو درونا چاریہ کو اپنا انگوٹھا پیش کر دیا، کوروں نے اپنے گرو کو سیناپتی بنا دیا، ارسطو برسوں گھوڑے پر سوار اپنے استاد کے سر پر چھتری لگائے دوڑا۔ میں ایک غریب اور کمزور طالبعلم ہوں میں

آپ کو کیا بھینٹ دوں۔"؟ گرو جی مسکرائے، "بالک مجھے نہ تمہارا انگوٹھا چاہئے نہ کوئی سمان اور نہ تمہاری چاکری۔

میں چاہتا ہوں کہ جو میں نے تمہیں دیا اسے سدا یاد رکھو۔ یاد رکھو کہ گیان ایک ساگر ہے۔ ہم اور تم ایک بوند کر ترس رہے ہیں جو پایا ہے وہ بوند سے بھی کم ہے۔ اس پیاس کو جیون بھر مرنے نہ دینا۔ جس نے یہ سمجھا کہ اس نے اپنا پیالہ بھر لیا سمجھو وہ مر گیا۔ آلوچنا کا سواگت کرو کیونکہ آلوچنا اور نندا نیم کی پتیوں کے سمان ہوتی ہے۔ انتر آتما کی شدھی کر دیتی ہے۔

"اگر گرو دکشنا دینا ہی چاہتے ہو تو مجھے اپنا گھمنڈ، آہنکار، کرودھ، اما نشتا اور اسہن شیتلا دان کر کے جاؤ کہ میں اسے اگنی میں بھسم کر دوں۔"

طالب علم کا غرور چور چور ہو گیا اور غبارے سے ہوا نکل گئی۔

میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

وہ ایک راز تھا۔ ایک عظیم الشان راز، ایک گرانقدر و گراں بار راز، وہ راز جو کائنات کا راز تھا، وہ راز جو ارض و سما کے چودہ طبقوں میں پنہاں تھا، وہ راز جو دونوں جہانوں پر محیط تھا، وہ راز جو احدیت اور ابدیت کا راز تھا۔ وہ راز اس شخص کو ودیعت ہوا جسے اولیت کا شرف حاصل تھا۔ اس نے وقت آخر اپنے بیٹے کو اسے سونپ کر سبک دوشی کے احساس کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ عرصہ تک یہ راز نسلاً در نسل منتقل ہوتا رہا لیکن پھر بیٹے نا اہل ہونے لگے وہ اس امانت کے بارِ گراں کی حفاظت کے قابل نہ رہے تو اس سرمایہ حیات کو جانچ پرکھ کے بعد اس شخص کو سونپا جانے لگا جو صاحب ظرف تھا اور اس کی حفاظت احکامات کی بجا آوری کے ساتھ باحسن و خوبی کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

قرنوں صدیوں سے پوشیدہ یہ راز سہواً ایک ایسے شخص کو معلوم ہو گیا جس کا قلب و ظرف کمزور تھا۔ وہ اسے پوشیدہ نہ رکھ سکا اور راز لبوں تک آ گیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، کہرام مچ گیا کیونکہ اہل نظر تو بہت تھے لیکن اہل دل کم تھے جو اس کی حقیقت کو سمجھ سکتے۔ کفر کے فتوے صادر ہونے لگے، سزائیں تجویز ہونے لگیں، جرم نا قابل

معافی تھا تو تختہ دار مقدر ٹھہرا۔ جو حقیقت شناس تھے وہ اور محتاط ہو گئے۔ قبل از فنا اور
بعد از فنا کی سزا کے خوف سے لرزاں راز کو مخفی رکھنے کی تجدید نو ہوئی۔

لیکن پھر ایک دن سنا گیا کہ شہر کی گلیوں میں ایک مجنوں اسی راز کو طشت از بام
کرتا پھر رہا ہے لیکن اسے دیوانے کی بڑ جان کو نہ کسی نے توجہ دی اور نہ کوئی سزا ہوئی۔

یہ وفا کی سخت راہیں

میری ایک کہانی ''جرم محبت'' اردو کے ایک مقبول رسالے میں شائع ہوئی تو میرے پاس تعریف کے بہت سے فون آئے جن میں ایک فون مشہور فلم ڈائریکٹر ابراہیم زری والا کا بھی تھا۔ انہیں میری کہانی اتنی پسند آئی کہ وہ اس پر فلم بنانا چاہتے تھے اور مجھ سے اسکرپٹ لکھنے کی فرمائش تھی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ''یہ ایک سچی کہانی ہے جس کا مرکزی کردار جیل میں ہے۔ میں اس کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔'' وہ تو سر ہو گئے۔ صبح شام فون کرنے لگے۔

ہوا یوں تھا کہ میں ایک این جی او کے ساتھ تہار جیل گئی تھی۔ وزٹ کے دوران خطرناک مجرموں کی سیل میں مجھے 35-30 سال کا ایک شریف سا آدمی نظر آیا جس کے بستر پر کچھ اردو کی کتابیں رکھی تھیں۔ اور لوگ آگے بڑھ گئے، لیکن میں وہیں رک گئی، بات چیت سے پتہ چلا کہ وہ پندرہ سال سے جیل میں ہے۔ اس پر دہشت گردی اور وطن سے غداری کا الزام ہے۔ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ماں کے ساتھ ماموں سے ملنے پاکستان گیا تھا۔ وہاں ماموں کی بیٹی سے عشق

ہو گیا۔ زندگی کے کچھ بہترین دن وہاں گزرے کیونکہ آگ دونوں طرف لگی تھی۔ پھر واپس آنا پڑا۔ نوجوانی کی عمر اور عشق کی جنوں خیزیاں کسی کل چین نہیں تھا۔ موبائیل نیا نیا آیا تھا اور تحفے میں ملا تھا، دن میں کئی کئی بار باتیں ہونے لگیں۔ جہاں سکون ملتا وہیں بے قراریاں بڑھ جاتیں۔ ابا کی کباڑی کی دوکان سنبھال رہا تھا کہ ایک دن محلے کے مندر کے سامنے کچھ شرپسندوں نے دھماکے کر دیئے۔ پولیس اقلیتی فرقے کے بہت سے نوجوانوں کے ساتھ اسے بھی پکڑ کر لے گئی اور پولیس ریمانڈ پر ڈال دیا۔ اس کا موبائیل اور پاسپورٹ ضبط ہوا تو پڑوسی ملک کا سفر اور موبائیل پر کثیر تعداد میں کالوں نے شک کا دائرہ تنگ کر دیا۔

کباڑی کی دوکان سے پیپسی کے خالی ڈبے اور زنگ آلود کیلیں برآمد کر لی گئیں اور وہ آتنک وادی قرار پا گیا۔ مقدمے بازی میں مکان دوکان سب بک گئے اور امی ابا قبر میں جا سوئے۔

زری والا کے اصرار پر میں نے ایک بار پھر بمشکل اجازت نامہ حاصل کر کے اس سے ملاقات کی اور سمجھایا۔

''بہترین وکیل کر کے تمہاری ضمانت کروا دیں گے ہو سکتا ہے کہ بری ہو جاؤ۔ تمہاری زندگی پر بایو پک بنے گی پیسہ ملے گا نام ہوگا۔''

لیکن وہ کسی طور راضی نہیں ہوا۔ ''میڈم میرے ماتھے پر تو آتنک وادی کا ٹھپہ لگ چکا ہے، لیکن وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی ہوگی۔ میں اسے بے آبرو نہیں کروں گا۔''

امر بیل

شاعر نے اپنے باغیچے کے پسندیدہ کنج میں کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے ایک طائرانہ نظر کنج میں ایستادہ پیڑ پودوں پر ڈالی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا لیکن افق کے مشرقی کناروں پر سرمئی اور نارنجی رنگ گلے مل رہے تھے۔ نسیم سحری کے زندگی بخش جھونکے ذہن کو نئی تازگی اور رفعتیں عطا کر رہے تھے۔ بہار اپنے شباب پر تھی۔ زمین سے آسمان تک حسن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ شاعر کو لگا جیسے یہ درخت اور پودے آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔

چنبیلی، جوہی اور حسن حنا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سرگوشیاں کر رہی تھیں اور اپنے حسن اور خوشبو کی سحر آفرینی پر نازاں تھیں۔ سہ رنگی گلاب ان سرگوشیوں کو سن کر حقارت سے ہنس رہے تھے۔ بھلا حسن کے بادشاہ کے سامنے یہ مجال! نرگس روتے روتے ہنس پڑی تھی۔ سرخ اور بسنتی پھولوں سے لدے گل مہر اور املتاس بچوں کی تعلیاں سن کر شفقت سے مسکرا رہے تھے۔ سب اپنے میں مگن مگر متحد!

اچانک شاعر کو مہندی کے جھاڑ کا خیال آیا۔ وہ تو سب سے زیادہ مغرور تھا کہ وہ سہاگنوں کی ہتھیلیوں کو سجاتا ہے، بوڑھوں کو جوان بناتا ہے۔

شاعر یہ دیکھ کر سہم گیا کہ مہندی اور مالتی کے جھاڑوں کو زرد اور زعفرانی امر بیل جکڑتی جا رہی تھی۔ وہ سوکھتے جا رہے تھے اور امر بیل تر و تازہ ہوتی جا رہی تھی۔

شاعر گھبرا گیا۔ اسے تو فوراً اکھاڑ پھینکنا چاہیے ورنہ یہ پورے باغیچے کو اجاڑ دے گی۔ لیکن پھر شاعر بھول گیا۔ اس کی نظموں کی کتاب تیار ہوگئی تھی۔ اس کی تشہیر کرنے اور داد و تحسین وصول کرنے وہ شہروں شہروں گھومتا رہا۔ جب واپس لوٹا تو گلشن اجڑ چکا تھا۔ گلاب، چنبیلی، جوہی، حسن حنا، نرگس کی تباہی پر گل مہر اور املتاس اشک فشاں تھے اور امر بیل قہقہے لگا رہی تھی۔

شاعر شرمندہ تھا۔ یہ سب اس کی کوتاہی کا نتیجہ تھا، لیکن اب بس۔ اور نہیں۔ وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس زعفرانی امر بیل کو اکھاڑ پھینکنا ہے اور اپنے اجڑے چمن کو پھر بہاروں سے ہمکنار کرنا ہے۔

مس فٹ

وقت کی عادت ہے کہ جب گذر رہا ہوتا ہے تو یوں دبے پاؤں گذر جاتا ہے کہ احساس بھی نہیں ہوتا، لیکن بعد میں پیچھے مڑ کر دیکھو تو اتنی دور کھڑا مسکرا رہا ہوتا ہے کہ واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

پچھلے تیس سال میں جن جانی پہچانی راہوں سے گذرتا رہا وہاں قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں، بھاری پتھر راستہ روکے کھڑے تھے۔ ہر گام پر پتھر ہٹاتے سر جھکائے چلتا رہا اور جب راستہ صاف ملا کہ اپنی شرطوں پر سفر کر سکوں تو لگتا ہے جیسے ایک گہری لمبی نیند سے جاگا ہوں۔ کاندھوں پر عمر رفتہ کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ راہوں میں نئے موڑ نکل آئے ہیں، ہر شناسائی میں اجنبیت در آئی ہے۔

درخت ہیں لیکن سایہ نہیں ہے، پھول ہیں لیکن نزاکت، نفاست اور خوشبو کا فقدان ہے، پھول سبز پتوں کی قبا کی جگہ حریری لباس میں ملبوس ہیں، پرندے ہیں لیکن آنکھوں میں معصومیت نہیں ہے، نغموں میں مٹھاس نہیں ہے، منقاریں خون آلود ہیں، پھل ہیں لیکن ذائقہ تلخ اور کتوں، سوروں سے مشابہ ہے، کنویں ہیں لیکن ان پر مختلف رنگ کے مینڈکوں کا قبضہ ہے، تالاب ہیں لیکن مگرمچھوں کی حکمرانی ہے۔ پیاس ارزاں

ہے پانی مہنگا ہے۔

پیٹ میں بھوک اور گلے میں پیاس لیے میں وحشت زدہ سا باہر نکلنے کی تگ ودو میں تھا کہ ایک بوڑھا پرگدھ نظر آیا جس کی سال خوردہ ڈاڑھی تہذیب رفتہ کی یاددلا رہی تھی۔ میں نے پناہ لینی چاہی تو وہ جاں کنی کے عالم میں بولا، ''کسے ڈھونڈھ رہے ہو؟ میں اورتم اب یہاں مس فٹ ہیں'' اور ایک دلخراش چیخ کے ساتھ مجھے سمیٹتا ہوا زمیں بوس ہو گیا۔

پتھر کے صنم

روز کی طرح آج بھی میں بیڈ پر نیم دراز اپنی حسین و مہ جبیں بیوی روحی کا منتظر تھا جو آئینے کے سامنے اسٹول پر بیٹھی افزائش حسن کے نسخے آزما رہی تھی۔ پہلے اس نے میک اپ اتارنے کے لئے مختلف سیالوں کو روئی پر لگا کر چہرہ صاف کیا، پھر مختلف لوشن لگا کر جلد چمکاتی رہی، پھر نائٹ کریم سے اپنے گلاب سے چہرے، چاندی سی سڈول بانہوں اور مرمری ترشی ہوئی پنڈلیوں کا مساج کیا، گھنی سیاہ گھنگھریالی زلفوں پر برش پھیرتی رہی۔

روز اسی طرح شب خوابی کے حریری لباس میں مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا کر میرے جذبات سے کھیلتی اور آخر جب میری بانہوں میں آتی تو میں اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر سرگوشی کرتا، ''روحی تم دنیا کی حسین ترین عورت ہو اور اگر تم ماں بن جاؤ تو کائنات کی سب سے خوبصورت ہستی بن جاؤ گی کیونکہ ماں تا کا نور تمہارے حسن کی تکمیل کر دے گا۔''

اور وہ چڑ کر کہتی، ''ہاں! موٹے پھولے ہوئے رخسار، بھدی کمر، بے ڈول جسم، مجھے حسن کی انتہا پر پہنچا دیں گے نا! یہی چاہتے ہو تم! رامش تم مجھ سے کچھ بھی

مانگ لولیکن میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ نہ تو مجھے بچوں سے دلچسپی ہے اور نہ میں اپنی فگر کھونا چاہتی ہوں۔''

کچھ دیر کو میرے جذبات پر برف گر جاتی پھر میں اس کے جسم کی رعنائیوں میں کھو جاتا۔

مجھے بچوں سے عشق ہے۔ میری امی ہر ماہ فون پر پوچھتی ہیں، ''کوئی خوشخبری؟''

کیا جواب دوں! کہ میں ایک ادھوری عورت کے ساتھ زندگی گذار رہا ہوں۔

آج ہماری شادی کی بارہویں سالگرہ تھی۔ ہم پارٹی سے لوٹے تھے اس لیے اسے میک اپ اتارنے میں اور دیر لگ رہی تھی۔ میں آج بھی انتظار کی سولی پر لٹکا تھا لیکن آج میرے ارادے کچھ اور تھے۔

بالآخر اس نے پرس سے ایک لفافہ نکالا اور مضمحل سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیتے ہوئے کہا، ''رامش، شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ یہ تمہارا تحفہ ہے۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن اپنی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی''۔

وہ خلع کے لیے دی گئی درخواست کی کاپی تھی۔ میری انگلیاں تکیے کے نیچے رینگ گئیں جہاں لفافے میں طلاق نامہ تھا۔

دو وقت کی روٹی

خاں صاحب کی تیسری بیوی جب اللہ کو پیاری ہوئیں تو تجہیز و تکفین میں گنے چنے محلے والے شریک تھے لیکن سوئم کے دن جب لڈن کے ڈھابے کی بریانی پر فاتحہ پیش کی گئی تو نہ صرف خانصاحب کے قریبی دوست شامل ہوئے بلکہ محلے کے کچھ نوجوان بھی یار دوستوں کے ساتھ چلے آئے۔

خان صاحب کے یار غار مرزا صاحب جنھوں نے ہمیشہ خان کی قسمت پر رشک کیا تھا، دل کی بات زبان پر لے ہی آئے۔

''خان یار تم ہو بڑے خوش قسمت۔ لوگ کہتے ہیں مرد دو بیویوں کو تو دفنا دیتا ہے لیکن تیسری جان لے کر ہی رہتی ہے۔ لیکن تم نے تو تینوں کا ٹکٹ کٹا دیا۔''

خان صاحب نے سفید براق ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے صمیم قلب سے ''الحمدللہ'' کہا پھر مرزا سے مخاطب ہوئے۔ ''مرزا میں تو بالکل تنہا رہ گیا۔ دو وقت کی روٹی کا بھی آسرا نہ رہا۔ بچوں نے امریکہ کنیڈا بسا لیا۔ مجھے تو کوئی پانی دینے والا بھی نہیں ہے۔''

کسی نوجوان نے کہا ''انکل آپ کل وقتی ملازمہ رکھ لیں''۔ خان صاحب نے

ڈیڑھ آنکھ سے ڈھائی آنسو بہا کر کہا۔

''برخوردار۔ ملازمہ میں وہ بیوی والی دل سوزی کہاں!''

پھر مرزا سے بولے ''مرزا میرے دوست کوئی تیس بتیس سال کی بیوہ یا مطلقہ ہوتو میں نکاح ثانی کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''نکاح چہارم'' کسی منچلے نے ٹکڑا لگایا۔

مرزا نے جھٹ پیغام دے دیا۔ ''میری سسرالی عزیزہ ہیں، نہایت نیک، شریف اور پاکباز و پردہ دار بیوہ ہیں۔ تیس سے کچھ اوپر ہیں۔ کہو تو بات چلاؤں۔''

خان صاحب کے چہرے پر نور اتر آیا۔ ''نیکی اور پوچھ پوچھ! مرزا ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔ جلد سے جلد یہ کار خیر کروا دو۔''

ایک ماہ بعد خانصاحب نے شمامۃ العنبر میں مہکتے ہوئے حجلہ عروسی میں قدم رکھا۔ مسہری پر سرخ کپڑوں میں ملبوس جو وجود متمکن تھا، اس کا حجم کچھ زیادہ تھا یعنی تناسب سے تجاوز کر گیا تھا۔ ''کوئی بات نہیں ہے۔'' خانصاحب نے دل کو بہلا کر گھونگھٹ اٹھایا۔

رنگے ہوئے بالوں کے نیچے جو چہرہ تھا وہ ہندوستان کے ریلوے نقشے کا صفحہ معلوم ہو رہا تھا۔ ان کی نظر باسی ڈبل روٹی جیسے مرتمش ہاتھوں پر نظر پڑی تو ایک لمبی ''استغفر اللہ'' کے ساتھ گھونگھٹ چھوٹ گیا۔ ''خدا تمہیں سمجھے مرزا! ان ہاتھوں سے تو توے پر روٹی بھی نہیں پڑے گی۔''

موصوفہ نے بتیسی فری منہ سے لب کشائی کی ''میں کھچڑی بہت اچھی پکاتی ہوں۔''

ایماندار

میں ابھی آفس پہنچ کر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ رام کھلاون دستک دے کر گھبرایا ہوا کیبن میں داخل ہوا۔

"سر جی ایک دن کی چھٹی چاہیے۔ پتا جی بہت بیمار ہیں۔ دیکھنے جانا ہے۔"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

"ٹھیک ہے چلے جاؤ۔ پیسہ چاہیے ہو تو گپتا جی سے ایڈوانس لے لو۔"

"نہیں سر جی۔ آپ کی دعا سے سب ٹھیک ہے۔ کھیت کھلیان سب ہیں وہاں۔"

"تو پھر اپنے باپ کو ساتھ لے آؤ۔ شہر میں علاج اچھا ہو جائے گا۔ ہر مہینے ایک دن کی چھٹی لے کر آٹھ گھنٹے کا آنا جانا کرتے ہو۔ کوئی سیوا بھی نہیں کر پاتے ہو گے۔ صرف صورت دیکھ کر چلے آتے ہو۔"

"سر جی سیوا کے لیے وہاں دو بھائی ہیں۔ اچھی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ میں تو صورت دکھانے جاتا ہوں۔"

"اچھا تمہیں یاد کرتے ہوں گے تمہارے پتا جی"؟

''نہیں سر جی۔ وہ تو پہچانتے بھی نہیں۔ بدھی کام نہیں کرتی ان کی۔''

''پھر کس کو صورت دکھانے جاتے ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بھائیوں کو سر جی۔ ابھی نہ جاؤں گا اور کل کو بڑھو کھسک لیے تو جب گھر دوار کا بٹوارہ ہوگا تب بھائی کہہ دیں گے ''بیماری میں تو صورت بھی نہیں دکھائی۔ اب حصہ مانگنے آ گئے۔''

ہمارے اپنے

اس محلے میں شفٹ ہوئے ،ہمیں چار ماہ ہو چکے تھے ،لیکن ابھی تک کسی سے بھی صاحب سلامت نہیں ہوئی تھی ۔ کالونی بہت اچھی تھی ۔ گیٹ پر چوکیدار رہتا تھا۔ سہولتیں سوسائٹی مہیا کرتی تھی ۔ پڑھے لکھے لوگوں کی رہائش تھی ۔ جب ہم مکان دیکھنے آئے تھے تو کالونی میں پیپل کے پیڑ کے نیچے مندر کے ساتھ پچاس گز کے پلاٹ میں ایک چھوٹی سی ایک مینارہ مسجد دیکھ کر شبانہ کو اطمینان ہوا تھا کہ چلو ''ہمارے اپنے'' بھی یہاں مقیم ہیں ۔ لیکن روز و شب کی بھاگ دوڑ میں مسجد جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ صبح صبح شبانہ اور بچے اسکول اور میں دفتر کے لیے نکل جاتے ۔ بیوی بچے شام کو اور میں رات کو تھکے ہارے آتے اور گھر میں بند ہو جاتے ۔ اتوار کو گھومنے یا شاپنگ کے لیے نکل جاتے ایک دو بار کی زاید چھٹی میں مسجد گیا۔ دس بارہ نمازی نظر آئے ۔ میں نے بصد شوق سلام کیا لیکن انھوں نے سرد مہری سے سلام کا جواب دیا اور چلے گئے ۔

اسی اثنا میں شہر میں سیاسی گہما گہمی اور مذہبی تناؤ کا ماحول بن گیا۔ حکومت کی ضرر رساں پالیسیوں کی موافقت اور مخالفت میں دھرنوں اور جلوسوں کا بازار گرم ہوا۔ الیکشن قریب تھے ، مذہبی منافرت کی چنگاری کو ہوا دی گئی اور فسادات پھوٹ پڑے ۔

ہماری کالونی اس علاقے سے قریب تھی جہاں خون خرابہ اور آتش زنی کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ عدم تحفظ کا احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔ مسجد میں نظر آنے والے کئی چہرے اہل وعیال کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر جا چکے تھے۔ ہم کہاں جاتے۔ شہر میں کوئی اپنا نہیں تھا۔

آخر ایک دن صبح ماحول ایک دم گرم ہو گیا۔ دور سے اشتعال انگیز نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ کالونی کے بہت سے لوگ ماتھے پر لمبے تلک لگا کے مندر سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گیٹ بند تھا لیکن چوکیدار بھاگ گیا تھا۔ ہجوم بڑھ رہا تھا۔ کچھ نوجوان گیٹ پر سے کود کر اندر آ گئے۔ انھوں نے مسجد کے مینار پر بھگوا رنگ کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔ ہمارے تلک دھاری پڑوسیوں نے دنگائیوں سے گرما گرم بحث کے بعد ہوائی فائر کیے۔ بھیر تتر بتر ہو گئی، ایک تلک دھاری پڑوسی نوجوان نے مسجد کی مینار سے بھگوا جھنڈا اتار کر پھینک دیا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں گھر سے نکل آیا اور احساس تشکر سے اس نوجوان کو سینے سے لگا لیا۔ کئی تلک دھاری میرے گرد جمع ہو گئے۔ ایک نے میری پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔ ''نشچنت رہو۔ میاں جی آپ تو ہمارے اپنے ہو۔''

سبق

سراج میاں اماں کے اکلوتے لاڈلے بیٹے تھے۔ شادی کے گیارہ سال بعد ہزاروں منتوں، مرادوں، دعاؤں کے بعد ان کی چاندسی صورت نظر آئی تھی۔ پھولوں پانوں کی طرح پالا تھا۔ تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن لاڈ پیار نے کاہل بنادیا تھا، اماں ہل کے پانی نہیں پینے دیتی تھیں۔ ہر چیز مانگنے سے پہلے مل جاتی تھی۔ بابا جان ریٹائر ہوئے اور سراج میاں کی نوکری لگی۔ اماں کی جملہ خدمات بھی ان ہی کو ٹرانسفر ہو گئیں۔

سراج کا تبادلہ بنگلور ہونے والا تھا تو اماں کو فکر ہوئی بیٹا اکیلا کیسے رہے گا۔ لڑکی پہلے سے دیکھی بھالی تھی اماں نے جھٹ بیٹے کے سر سہرا باندھ دیا اور کائنات دلہن بن کر آ گئی۔ پندرہ دن کا جوائننگ ٹائم ملا تھا۔ ہفتہ بھر ہنی مون میں نکل گیا۔ ایک ہفتے کا وقت کائنات کو سسرال میں رہنے کو ملا۔

کائنات دیکھ رہی تھی کہ بابا جان بے چارے ایک پیالی چائے کے لیے صدائیں لگاتے رہتے اور اماں بیٹے کی مدارات میں لگی رہتیں۔ کئی مرتبہ تو کائنات نے نئی دلہن ہونے کے باوجود انہیں چائے بنا کردی۔

ایک ہفتے بعد سراج بیوی کو لے کر بنگلور آ گئے۔ نئی گرہستی بس گئی۔ لیکن سراج میاں کے سر اماں کے لاڈ کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ کائنات پورا خیال رکھتی لیکن سراج کو ہر بات میں اماں یاد آتیں۔

''ارے مونگ کی دال میں لہسن کا بگھار مجھے بالکل پسند نہیں۔ اماں میرے لیے ارہر کی دال میں پیاز کا بگھار کرتی تھیں۔''

اماں یہ کرتی تھیں، اماں وہ کرتی تھیں۔ کائنات بڑے صبر کے ساتھ اماں نامہ سنا کرتی۔

آفس جانے سے پہلے سراج نہانے گئے۔ کائنات ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ سراج نے آواز لگائی۔

''میرے کپڑے کہاں ہیں بھئی۔ گھڑی، والیٹ، رومال کہاں ہیں سب۔''

کائنات نے کچن سے جواب دیا'' آپ کی الماری میں سامنے ہی رکھا ہے سب۔''

سراج تولیہ باندھے کچن میں چلے آئے'' بے بی، اماں ساری چیزیں نکال کر بیڈ پر رکھ دیا کرتی تھیں مجھے وہی عادت ہے۔''

کائنات نے جل کر کہا'' میں نے آپ کی اماں سے سبق سیکھ لیا ہے۔ جب ہمارے بچہ ہوگا تو میں بھی اسے ایسے ہی ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر پالوں گی۔''

گٹھلیوں کے دام

آفتاب شیرازی ملک کے ان معدودے چند خوش حال صنعت کاروں میں سے ایک تھے جن کا کاروبار لاک ڈاؤن اور وبا کے زمانے میں بھی پھل پھول رہا تھا۔ دو سال پہلے انھوں نے یونانی دواؤں کا جوینٹ شروع کیا تھا، وہ خصوصیت سے اس وقت بلندی پر چل رہا تھا یہی وجہ تھی کہ نہ ان کے اسٹاف کی چھٹنی ہوئی، نہ کسی کی تنخواہ رکی اور نہ کسی کو مالی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ آفتاب کو اللہ کی مدد، اپنی نیک نیتی اور اپنے اسٹاف کی ایمان داری اور وفاداری پر پورا بھروسہ تھا۔ آفتاب اور زریں گھر اور دفتر سے کاروبار کامیابی کے ساتھ چلا رہے تھے۔

لیکن اس دن ایک چھوٹی سی بات ایسی ہوگئی جس نے ان کے ذہن میں گرہ سی ڈال دی۔

آفتاب شیرازی کو آموں سے عشق تھا۔ جب تک ملک کے کسی بھی حصے آم کی فصل رہتی، ان کی میز پر آم کا ہونا ضروری تھا تو اس دن صبح خانساماں بندے حسن نے گھبرا کر زریں کو اطلاع دی۔

''غضب ہوگیا میم صاحب۔ آج ناشتے میں آم نہیں ہیں۔ میں کل چھٹی پر

تھا، دیکھ نہیں پایا۔''

زریں نے کہا، کسی کو بھیج کر سوسائٹی کے گیٹ کے باہر ٹھیلے سے آم منگوالو۔

بندے حسن باہر نکلا تو گاڑیاں دھونے والا لڑکا پنکج کام ختم کر کے اپنی سائیکل صاف کر رہا تھا۔ بندے حسن نے اسے دوڑایا۔

ناشتے میں آفتاب سپیدہ چکھ کر پھڑک گئے۔ ''بھئی بیگم، بہترین آم ہے کہاں سے منگوایا؟ کیا بھاؤ آیا؟''

بندے حسن نے جواب دیا ''حضور گیٹ کے باہر سونو پھل والے کے ہاں 60 روپیہ کلو کا ہے۔

''بھئی یہ آم اور منگوالو۔''

اسی وقت ان کے ایک اسٹاف ممبر سجاد چابیوں کا بیگ اٹھائے گزرے۔ دفتر اور کارخانوں کی چابیاں انہیں کے پاس رہتی تھیں۔ آفتاب نے آواز دی۔ ''سجاد ذرا گیٹ کے پھل والے سے سپیدہ دیتے جانا۔'' پانچ منٹ میں ہی سپیدہ حاضر تھا۔ آفتاب نے پوچھا ''کیا حساب ملا؟'' سجاد نے جواب دیا۔

''80 روپیہ کلو، سر'' اور چلے گئے۔

آفتاب کے ذہن میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ تب ہی ڈیلیوری وین کا ڈرائیور دنیش زریں میڈم سے ہدایات لے کر نکلا تو آفتاب نے اسے بھی آم لانے کا حکم دیا۔

پانچ دس منٹ میں آم پینٹری میں پہنچ گئے۔ دام پوچھنے پر جواب ملا۔

''ایک سو بیس روپیہ کلو۔'' ایک اور گرہ پڑ گئی۔

اتنے میں مس جوزف اپنے رجسٹر سنبھالتی ہوئی آئیں، ان کا کام اسٹاف کی لڑکیوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنا تھا۔ شیرازی سر نے ان کو بھی آم لانے کا حکم دے ڈالا۔

انہیں حیرت بھی ہوئی لیکن ذرا کی ذرا میں آم میز پر تھے۔ قیمت کے استفسار پر جواب ملا۔

''ڈیڑھ سو روپیہ کلو''۔

ایک اور گرہ!

آخر میں ان کے پرانے وفادار منیجر ورما جی میڈم سے بات کر کے نکلے تو شیرازی سر نے ان سے بھی آم لانے کی فرمائش کر دی اور بازیابی کے بعد آم کی قیمت 200 روپیہ کلو سن کر ان کا ذہنی توازن منتشر ہو گیا۔

''کیا میری نوازشات میں کوئی کمی رہ گئی کہ میرا ایماندار اسٹاف دس بیس روپیوں کے لیے مجھے چونا لگا رہا ہے۔!''

زریں اپنے آفس روم سے نکل کر ادھر ہی چلی آئیں۔ ''کیا بات ہے آپ آفس نہیں جا رہے ہیں۔ آج تو آپ کی ایک اہم کانفرنس ہے۔؟''

''شاید آج نہ جاؤں۔ ذہن حاضر نہیں ہے۔

''ایسے نہیں چلتا۔ دفتر جائیے اور جاتے ہوئے سونو کے ٹھیلے سے پپیدہ دیتے جائیے گا۔''

آفتاب شیرازی کو لگا ان کی ذہین بیوی نے ان کی چوری پکڑ لی۔

ان کی کلاسک شیورلے جب سونو کے ٹھیلے کے پاس رکی تو سونو اور اس کے بیٹے ہاتھ جوڑ کر دوڑے چلے آئے۔

شیرازی نے پوچھا ''پپیدہ کیا بھاؤ ہے۔'' ''تین سو روپے کلو مالک۔''

''کیا بکواس ہے۔ ساٹھ روپیہ کا آم تین سو میں بیچ رہے ہو۔'' وہ گرجے۔

''دھندے کی قسم مالک۔ آپ شہر کی کسی دوکان پر چلے جائیں۔ اس سے کم مل جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔''

آم لے کر واپس آئے تو شیرازی کے دماغ کی سب گرہیں کھل گئی تھیں لیکن موٹا سا سوالیہ نشان کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ دو گھنٹے میں قیمت میں یہ اچھال نا قابل یقین!

زریں نے انہیں چشمہ، رومال اور ماسک پکڑاتے ہوئے کہا۔

''پنکج آم لینے سائیکل پر گیا تھا، سجاد بائیک پر، دنیش ڈیلیوری وین میں، مس جوزف اسٹاف کار میں، ورما جی ہونڈا اسٹی میں اور آپ پجیرو میں۔

یہ آم کی قیمت نہیں تھی شیرازی صاحب یہ گٹھلیوں کے دام تھے جو پھل والا لوگوں سے وصول کر رہا تھا۔''

تضاد

ٹرین کے اے سی ڈبے میں داخل ہو کر ابھی میں سامان کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ بچوں نے شیشے کے اس پار خوانچے والوں کو دیکھ کر فرمائشیں شروع کر دیں۔ ''ممی بریڈ پکوڑا، ممی سموسہ، ممی فروٹی'' لاکھ سمجھایا کہ بازار کی چیزیں نہیں کھاتے، ہمارے پاس کھانے پینے کا بہت سامان ہے، لیکن وہ تو ضد پر اڑ گئے۔ ناچار ساری چیزیں خرید دیں۔ ان کے پیٹ بھرے تھے مگر نیتیں سیر نہیں تھیں۔ ایک دو نوالے لے کر ہاتھ کھڑے کر لیے۔ میں نے بعجلت ساری چیزیں اخبار میں سمیٹیں اور سامنے پلیٹ فارم پر رکھے کوڑے کے ڈبے پر رکھ آئی۔ چلتی گاڑی کی کھڑکی سے میں نے دیکھا کہ دو کتے اور تین بچے اس کھانے کے لے چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔

تحفہ

ایک تھی شہزادی اور ایک تھا شہزادہ۔ دونوں بے حد حسین، بے حد ذہین، تعلیم یافتہ، سمجھدار۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ ان کے والدین پڑوسی ریاستوں کے حکمراں تھے اور دوست تھے۔ بچپن سے آنا جانا تھا۔ جب بڑے ہوئے تو والدین نے ان کی شادی طے کر دی۔ دونوں طرف زور شور تیاریاں ہونے لگیں۔

ایک دن شہزادہ شہزادی سے ملنے اس کے شہر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑے سے میدان کو ایک ہال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایک طرف رنگ برنگے قیمتی کپڑوں کے ڈھیر لگے ہیں، درزی بیٹھے سلائی کر رہے ہیں، ایک طرف ہیرے جواہرات کے زیورات گڑھے جا رہے ہیں، کہیں لکڑی کا سامان بن رہا ہے۔ شہزادے نے حیران ہوکر پوچھا، ''یہ سب کیا ہے۔'' شہزادی نے کہا ''یہ میرے جہیز کی تیاری ہے۔'' شہزادے نے کہا'' آپ کو معلوم ہے میرا ذاتی محل دنیا بھر کے قیمتی سامان سے بھرا ہوا ہے۔ امی جان آپ کے لئے آپ کی پسند کے ڈھیروں ملبوسات تیار کروا رہی ہیں؟۔ آپ اپنے ابا جان سے کہیے اس کے بجائے اپنے ملک کی سیکڑوں غریب لڑکیوں کی شادی کروا دیں۔''

شہزادی راضی ہوگئی۔ پھراس نے پوچھا ”یہ بتایئے آپ شادی پر ہمیں کیا تحفہ دے رہے ہیں؟“

شہزادہ بولا ”چلیے ہم آپ کو یہ دکھاتے ہیں۔ ایسا تحفہ جو نہ کسی نے دیکھا اور نہ سنا ہوگا“

دونوں گھوڑے پر سوار ہوکر چلے تو راستے میں ٹوٹی پھوٹی جھگیوں والے ایک گاؤں سے گذرے۔ سارے گاؤں والے، ننگ دھڑنگ بچے، کاندھے پر ہل رکھے ادھ ننگے کسان مزدور، گندے پانی کے تالاب سے پانی بھرتی کمزور عورتیں، ان دونوں کو دیکھنے کے لئے سڑک کے کنارے جمع ہوگئے۔ شہزادہ شہزادی آن کو لے کر ایک میدان میں پہنچا جہاں سیکڑوں مزدور اور مالی کام کر رہے تھے۔ شہزادے نے ایک بے حد خوبصورت باغ اور بارہ دری کا نقشہ دکھاتے ہوئے کہا ”دیکھیے ہم آپ کو تحفے میں دینے کے لئے یہ بے مثال باغ تیار کروا رہے ہیں۔“ شہزادی بولی ”اس زمین پر آپ اپنے ملک کے غریبوں کے لیے پکے گھر اور صاف پانی کا انتظام کر دیجیے، یہ ہمارے لیے بے مثال تحفہ ہوگا۔“

لاجواب

خاور علی ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا۔ آمدنی کم تھی لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ پرسکون مسکراہٹ رہتی کہ امیر لوگ بھی رشک کرتے۔

خاور ہفتے کے پانچ دن گھر اور دفتر کی ذمہ داریاں جی جان سے نبھاتا لیکن دو دن اس کے اپنے ہوتے۔ وہ صبح سے ہی قصبے کا چکر لگانے نکل جاتا۔ اللہ کے بندوں کی خدمت میں اسے سچی خوشی ملتی۔

کبھی بنواری کی بچی کو مست بیل سے بچایا، کبھی رحیم کے بیٹے کو آوارہ کتوں سے نجات دلائی، کبھی مسجد رضا خانی میں وضو کے لیے پانی بھر دیا، کبھی امام باڑے کے ٹوٹے دروازے کی مرمت کر دی تو کبھی اجتماع میں لوگوں کو پانی پلایا۔ کبھی درگاہ کی محفل قوالی میں چائے تقسیم کروادی۔ کبھی مولوی عبیداللہ کے گھر کا سودا لادیا تو کبھی مولانا کلب حیدر کے گھر گیس کا سلنڈر پہنچا دیا۔ راستے میں نماز کا وقت آ گیا تو کسی بھی مسجد میں نماز ادا کر لی۔

ایک دن محلے والوں نے طے کیا کہ وہ معلوم کر کے ہی رہیں گے کہ آخر خاور کا مسلک ہے کیا؟

لوگوں نے اسے اہل حدیث کی مسجد کے باہر کوڑا اٹھاتے ہوئے جالیا، ’’بھائی منافقت چھوڑو، سچ بتاؤ تمہارا مسلک کیا ہے؟‘‘

خاور نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا، پہلے آپ بتائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا کیا مسلک تھا؟

میرا بھی وہی مسلک ہے۔

امکانات

میرا بچپن نانی اور دادی کی کہانیوں میں شرابور ہو کر گذرا۔ نانی شہزادوں اور پریوں کی کہانیاں سناتیں اور دادی پیغمبروں، پیروں کے قصے سناتیں اور میں دونوں کا آمیزہ بنا کر محلے کے ہم عمروں کو سناتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعور آنے سے پہلے ہی خاندان میں کہانی کار کے طور پر مشہور ہو گیا۔ شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو حصول علم کے لیے مدرسے میں داخل کروادیا گیا۔ ابا نے کم عمری میں ہی حافظہ کرنے کے لئے ہاسٹل بھیج دیا۔

جب لکھنا آیا تو کہانیاں لکھنے لگا۔ لیکن میری کہانیوں سے اب پریاں غائب ہوگئی تھیں اور تقدس کا رنگ نمایاں ہو گیا تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹی پہنچا۔ عربی زبان میں ماسٹرس کیا اور دینیات کا مدرس مقرر ہو گیا۔ قلم فعال تھا، لیکن نہ جانے کیوں میرے افسانے اردو کے مؤقر رسالوں کے مدیر لوٹا دیتے تھے۔ صرف محدود حلقے میں پڑھے جاتے۔ تمنا تھی کہ شہرت کا دائرہ وسیع ہو تو میں نے ایک نسخہ آزمایا۔ مذہب کے ساتھ سیاست کو ملا کر کھچڑی پکائی، فرقہ واریت کا تڑکا لگایا، قرآن وحدیث کی خوشبوؤں سے بسایا اور سماجی سروکار کی چٹنی کے ساتھ افسانوں میں پیش کیا۔ لوگوں نے چٹخارے لے کر پسند کیا لیکن سنجیدہ ناقدین اور قارئین نے مین میخ

نکالی۔ پسند کرنے والے بھی دو دن میں بھول جاتے اور بریانی کی حمد و ثنا کرنے لگتے۔

اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ رات بھر بیٹھ کر اپنے خیال میں جو شاہکار سوشل میڈیا پر پیش کیا تھا اس پر سوائے چند ہم نفسوں کے بڑی لے دے ہوئی۔

میرے اوپر عجب مایوسی طاری تھی۔ شام کو کچھ مہمان آنے والے تھے۔ بیوی باورچی خانے میں ضیافت کے انتظام میں مصروف تھی۔ گیس کے چار چولہوں پر چار قسم کے کھانے چڑھے ہوئے تھے۔ الگ الگ کٹوریوں میں مصالحہ جات اور لوازمات رکھے تھے۔ بیوی میری مرجھائی صورت دیکھ کر بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ ہانڈی میں چمچہ چلاتے ہوئے بولی، ''دیکھئے آج میں مہمانوں کے لئے بریانی، قورمہ، دہی چاٹ اور کھیر پکا رہی ہوں۔ سب کے مصالحے الگ الگ رکھے ہیں۔ اب اگر میں کھیر میں بریانی کا مصالحہ اور قورمے میں چاٹ کا مصالحہ ڈال دوں تو کیا ہو!

میرے دماغ کی کھڑکیاں کھل گئی۔

ہر سخن وقتے و ہر نقطہ مقامے دارد۔

وفادار

جھگی جھونپڑی کالونی سے گذر کر شہر کے مضافات میں میری لاولد سہیلی نے شاندار فارم ہاؤس تعمیر کروایا تھا۔ آج اس کا گریہہ پرویش تھا۔ لمبی لمبی کاریں ڈرائیو وے میں پارک تھیں۔ میری سہیلی فخر کے ساتھ سب کو گھر دکھا رہی تھی۔ چار اے سی کمرے غیر ملکی سامان سے سجے اس کے چار اعلیٰ نسل کے کتوں کے لئے تھے۔ میں نے اس کے کان میں کہا ''ایک آدھ انسان کا یتیم بچہ بھی پال لیا ہوتا'' اس نے ناگواری سے سرگوشی کی، ''یہ کتے میرے وفادار ہیں۔ میرے لئے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ آدمی کے بچے کو پالوں گی تو کل میرا ہی گلا کاٹ کر سب پر قابض ہو جائے گا''۔

سر کٹا

کچھ دنوں سے شانتی پور میں ہر طرف اشانتی پھیلی ہوئی تھی۔ ظلم و جبر، لوٹ مار، دھوکا دھڑی، غنڈہ گردی، قتل و غارت، زنا و اغواء کا بازار گرم تھا۔ نہ کسی کی جان محفوظ تھی نہ مال نہ عزت۔ کمزور سب سے زیادہ نشانے پر تھے۔

کہا جا رہا تھا کی راکشسوں نے کچھ دیوتاؤں کو ہرا دیا تھا اور من مانی کر رہے تھے۔ یوں تو وہ انسانی بھیس میں ہوتے تھے لیکن جب کوئی شیطانی منصوبہ بنا رہے ہوتے تو ان کے شانوں سے سر غائب ہو جاتا تھا۔ کہیں داد فریاد نہیں تھی۔ پریشان حال عوام نے تحفظ اور انصاف مانگنے کے لیے ہر در پہ جبہ سائی کی۔ چوکیدار، پہرے دار، منصف، وزیر، ہر ایک کے پاس گئے۔ سب نے انھیں مدد اور انصاف دینے کا یقین دلایا۔ لیکن یقین دہانی کے بعد جب وہ لوگ اپنی کوٹھیوں اور بنگلوں میں جانے کے لئے مڑے تو عوام نے دیکھا کہ ان کے کندھوں پر سر نہیں تھا۔

ڈرے، سہمے، گھبرائے، دل برداشتہ لوگ جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو سوامی بابا کے پاس پہنچے، کیونکہ انسان جب مادی وسائل سے ناامید ہو جاتا ہے تو توہم پرستی میں پناہ لیتا ہے۔

سوامی بابا نے کہا ’’میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔ انصاف تمہارا حق ہے اور میں تمہیں دلوا کر رہوں گا۔ لیکن پہلے بڑے دیوتاؤں کو خوش کرنا ہوگا۔ میں تمہارے لیے یگیہ کروں گا۔ تم لوگ پوجا پاٹھ کی تیاری کرو، میں اسنان کر کے آتا ہوں۔‘‘ عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ناچتے، گاتے، نعرے لگاتے لوگوں کی نظر جب اسنان گر یہہ جاتے ہوئے بابا پر پڑی تو ان کے تھرکتے ہوئے قدموں کی طاقت جیسے سلب ہوگئی اور وہ زمین پر ڈھے گئے۔

اوقات

وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا امیر وکبیر باپ پچپاس برس اور ماں چالیس سال کے تھے جب طبیبوں نے جواب دے دیا تھا کہ اولاد ان کی قسمت میں نہیں ہے، لیکن وہ بطن مادر میں وارد ہو گیا۔ پیدائش کے وقت ڈاکٹر نے کہا ''ماں یا بچے میں کسی ایک ہی کو بچایا جاسکتا ہے۔'' باپ نے کہا ''ماں کو بچالیں۔'' لیکن ماں مر گئی اور وہ بچ گیا۔ جوان ہوا تو باپ کے ڈوبتے ہوئے کاروبار کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ جس وقت جو چاہا، حاصل کر لیا، جس پروجیکٹ پر نظر ڈالی، اس کی جھولی میں آگرا۔

وہ کہتا تھا ''دنیا میں چار چیزیں اہم ہیں، وقت، تقدیر زندگی اور موت، اور میں نے سب پر فتح حاصل کر لی ہے۔

پھر اس نے اپنے خوابوں کا گھر تعمیر کروایا۔ ایسا گھر، ایسا باغ جو دینا میں نایاب ہو۔ صدر دروازے پر جواہرات جڑی گھڑی آویزاں تھی جس پر 9 -6 -3 -12 کے بجائے وقت، تقدیر، زندگی، موت لکھا تھا۔

گریہہ پرویش کے لیے بارہ بجے کا وقت رکھا۔ جب اس نے باغ کے

دروازے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو اسے زور کا چکر آیا۔ سنبھلا تو دیکھا وقت نکل گیا۔ آگے بڑھا تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، تقدیر مٹھی سے پھسل گئی۔ حواس یکجا کرنے چاہے تو زندگی دھوکا دیتی محسوس ہوئی۔ قدم بڑھانا چاہا تو موت نے آغوش میں لے لیا۔

ہر فرعون کو موسیٰ ہے تو ہر شدّاد کے لئے عزرائیل ہے۔

عزت دار

ایک اونچی عمارت کے سامنے سڑک پر ایک جواں سال عورت کی لاش پڑی تھی۔ ساڑی اوپر سرک جانے سے اس کی برہنہ دودھیا ٹانگوں اور پیٹھ پر خراشوں کے تازہ نشان نمایاں تھے۔ منہ سے خون نکل کر سڑک پر پھیل گیا تھا۔ تماش بینوں کی بھیڑ میں طبقہ اعلیٰ کے تین افراد بھی تھے جن کے جسموں پر قیمتی لباس تھا اور انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹیاں تھیں۔ پولیس نے گھیرا بندی کردی، کوئی گواہی دیے بغیر نہیں جاسکتا۔ وہ تینوں اس bmw کی طرف بڑھے جس سے صبح لاش پھینکی گئی تھی تو انسپکٹر نے کانسٹیبل سے کہا "ان شریف آدمیوں کو جانے دو"۔

احتیاط

رات کے کسی پہر صوفے پر دور لیٹی ہوئی سائمہ سے سمیر نے کہا" کتنے دن ہو گئے، تم نے مجھے اپنے قریب بھی نہیں آنے دیا۔"

سائمہ نے جواب دیا"جب سے لاک ڈاؤن کھلا ہے تم نہ جانے کہاں کہاں گھومنے لگے ہو اور اکثر ناک پر سے ماسک بھی سرکا دیتے ہو! احتیاط بھی تو ضروری ہے۔

اگلے دن سائمہ نے بن سنور کر لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے سمیر کے پاس کئی چکر لگائے اور تھک کر بولی۔

"کیا بات ہے آج کل نہ تم مجھے محبت کی نظر سے دیکھتے ہو اور نہ ہی "آئی لو یو" کہتے ہو۔"

سمیر نے اسکرین پر سے نظر ہٹائے بغیر جواب دیا"تمہیں معلوم نہیں کہ کورونا کی ایک نئی قسم تیزی سے پھیل رہی ہے جو پچھلی والی سے 70% گنا زیادہ انفیکشس ہے۔ یہ محبت کی نظر اور پیار کے میٹھے بولوں سے بھی لگ سکتی ہے۔ احتیاط بھی ضروری ہے۔

جال

آئزک لینڈ کی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ دنیا کے کسی بھی ملک سے جو بھی شخص ہمارے ملک میں آکر بسے گا، ایک خطیر رقم کے علاوہ سبھی وسائل اور روزگار فراہم کیے جائیں گے۔

اپنے ملک کے نامساعد حالات کو دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ ایک نادر موقع تھا۔ میں نے بھاگم بھاگ سفر کی ضروری شرطیں پوری کیں۔ اپنے اور بیوی بچوں کے پاسپورٹ اور ویزہ کا انتظام کیا اور آئزک لینڈ جا پہنچا۔ ایئر پورٹ سے باہر نکلا تو شہر میں اس قدر ویرانی نظر آئی کہ میں گھبرا گیا۔ ایک غیر ملکی سیاح سے اس ویرانی کا سبب معلوم کیا تو اس نے بتایا ”آئزک لینڈ میں جتنے بھی وسائل تھے وہ ختم ہو چکے ہیں اور ان کے ساتھ ہی روزگار کے سارے ذرائع بھی ختم ہو گئے۔ آئزک لینڈ کا آخری خاندان کل ہی وسائل اور روزگار کی عدم موجودگی سے جھوجھتے ہوئے کہیں اور ہجرت کر گیا۔“

میں روؤں یا ہنسوں

نیویارک کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر امیگریشن کی ڈیسک کے قریب ہنگامہ دیکھ کر میرے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ اپنی پرواز کا انتظار کرتے ہوئے کئی غیر ملکی مسافر بھی متوجہ ہو چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میرا ہی ہم وطن جو بظاہر انگریزی زبان سے نابلد تھا، ہوائی اڈے کے اسٹاف اور سیکورٹی والوں کے نرغے میں حیران پریشان کھڑا ہوا تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی جس کے ہاتھ میں غالباً اس کا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات تھے، تیز آواز میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں قریب پہنچا تو میرے ہم وطن کی جان میں جان آئی۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا اور کہا ''صاحب آپ ذرا معلوم کرو کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے تو اپنے سارے کاغذات انہیں دے دیئے۔ اب وہ میڈم میرے کرونا کے ٹیکے کا سرٹیفکیٹ دکھا رہی ہے اور پاسپورٹ دکھا رہی ہے اور پتا نہیں کیا چلا رہی ہے۔ یہ لوگ مجھے کہیں بند کرنے لے جا رہے ہیں۔''

میں نے آگے بڑھ کر کاؤنٹر کلرک سے پرسشِ احوال کیا تو وہ نہایت ہی غصے میں بولی، یہ آدمی دھوکے باز ہے یہ جھوٹا کورونا ویکسین کا سرٹیفکیٹ پیش کر رہا ہے۔ اس

کے پاسپورٹ پر اس کی تصویر ہے لیکن کرونا ویکسین پر کسی اولڈ مین کی تصویر ہے۔ ہم اسے باہر نہیں جانے دیں گے۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، میں نے اپنا ویکسین سرٹیفکیٹ دکھایا تو وہ حیرت اور غصے سے بولی "تم بھی! تم سب انڈین چیٹر ہو۔ میں نے اسے سمجھایا، انڈیا میں ویکسین سرٹیفکیٹ پر آپ کے ہاں کی طرح ٹیکہ لگوانے والے کی فوٹو نہیں ہوتی بلکہ ہمارے پرائم منسٹر کی تصویر ہوتی ہے۔"

پہلے تو حیران ہوئی پھر وہ اور اس کے ساتھی قہقہہ مار کر ہنس پڑے، "یو انڈینس آر سو اسٹوپٹ پیپل"۔

آخری عدالت

وہ مجرم کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ فریادی وہ سب بے گناہ لوگ تھے جنہیں اس نے جھوٹے الزاموں میں سزا دلوائی تھی۔ جج کی کرسی پر ایک نور کا پالہ سا متمکن تھا۔ اس کی زبان خشک ہو کر اس کے تالو سے جا لگی۔ اس نے بہ مشکل اپنے لیے وکیل کی مانگ کی جو مسترد ہو گئی اور حکم ہوا کہ اپنی پیروی خود کرو۔

آنکھ کھلی تو دل پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ یہ کیسا نامبارک خواب تھا۔ نئے عہدے کے پہلے دن!

مہتاب خان عرف ایم کے ملک کا نامی گرامی فوجداری وکیل تھا، مشہور تھا کہ اگر اس کے ہاتھ کسی کا مقدمہ آجاتا ہے تو اس کی جیت یقینی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے وہ ایک پیشی کے گیارہ لاکھ روپے لیتا تھا۔ اس کے زیادہ تر موکل یا تو انڈر ورلڈ سے تعلق رکھتے تھے یا جانے مانے مجرم تھے۔ لیکن وہ عدالت میں وہ اس صفائی سے کسی بے گناہ کو پھنسا کر اپنے موکل کو بچا لیتا تھا کہ ایک طرف لوگ اس کی صلاحیت کے قائل ہو جاتے اور دوسری طرف اسے گالیاں اور بددعائیں دیتے تھے۔

حکومت نے اس کام کے آدمی کو وزیر قانون بنانا چاہا لیکن اس نے منظور نہیں

کیا۔ آخر عدالت عالیہ کی مجلس عاملہ نے اسے جج مقرر کر دیا جو اس کی دیرینہ خواہش تھی۔

اس کے سامنے پہلا مقدمہ ان تین لوگوں کے لواحقین کا آیا جن کو اس نے بے قصور پھانسی کی سزا دلوائی تھی۔ پہلے دن جب جج کی کرسی پر بیٹھا جہاں انصاف کی دیوی اس کی پشت پر کھڑی تھی، انصاف کا حلف نامہ سامنے تھا اور خواب پریشان اعصاب پر سوار تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی اور ہاتھ میں انصاف کا لرزاں قلم تھا۔

اگلے دن اس نے استعفیٰ دیا اور وہ مفقود الخبر ہو گیا۔

مانو یا نہ مانو

ایک تو اماوس کی رات اوپر سے سیاہ بادلوں کی یلغار، تاریکی شب دیجور کا مکمل استعارہ تھی۔ تیز و سرد ہوا کے جھونکے شہر کی تنگ گلیوں سے سیٹیاں بجاتے ہوئے اب جمنا کی لہروں کو بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے۔ دور لیمپ پوسٹ کی مدھم زرد سسکتی ہوئی روشنی میں درختوں کے جھومتے ہوئے دیو پیکر سائے ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سنسناہٹ پیدا کر رہے تھے، لیکن ماحول کی اس جنوں خیزی سے بے خبر و بے پروا بتول خالہ کے بوڑھے، گٹھیا زدہ قدم دیوانہ وار کسی ان دیکھی، انجانی منزل کی سمت رواں دواں تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، چادر سر سے ڈھلک گئی تھی، ایک سرا گریبان میں ٹھنسا ہوا تھا اور دوسرا زمین پر گھسٹ رہا تھا۔

شہر کی سنسان گلیاں اور سڑکیں پیچھے رہ گئی تھیں، جمنا کی لہروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

وہ بتول خالہ جنھوں نے کبھی حویلی سے قدم نہیں نکالا تھا، جانے کون سی مقناطیسی کشش تھی جو انھیں آدھی رات کو تنہا لیے جا رہی تھی۔

کل ہی کی تو بات تھی۔ گلی میں سپیرے کی بین کی آواز سن کر بڑے نواب

صاحب کی نوعمر یتیم پوتیوں نے سانپ کا تماشا دیکھنے کی فرمائش کی۔ بتول خالہ ان کی کوئی خواہش رد نہیں کرتی تھیں۔ چنانچہ مردان خانے کے برآمدے میں تماشا ہونے لگا۔ کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی معصوم، دلآویز چشماں آہو سپیرے کے دل میں کھب گئیں۔

استفسار پر بتول خالہ نے حسب عادت دکھڑا سنادیا کہ وہ یتیم بچیوں کی شادی کو لے کر کتنی پریشان ہیں۔ سپیرے نے جھٹ بٹوے سے تعویذ نکال کر دیتے ہوئے کہا، ''بڑی بٹیا کے بازو پر باندھ دو۔ دیکھنا ہفتہ بھر میں رشتہ پکا ہوجائے گا۔''

بتول خالہ نے اپنی چادر کے کونے میں باندھ کر گریبان میں ٹھونس لیا اور ایک سوا ایک روپے دے کر اسے رخصت کر دیا۔

بتول خالہ کے قدم جمنا کے ساحل پر سپیروں کی بستی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ بے قرار و منتظر سپیرا بیتابی سے آگے بڑھا لیکن بتول خالہ کو دیکھ کر ایک گندی سی گالی دی اور چادر ان کے گریبان سے کھینچ کر شدید غصے کے عالم میں لات مار کر انھیں دور اچھال دیا۔

آنکھوں کی مہکتی خوشبو

میرا تعلق ایک قدامت پسند خاندان سے تھا جہاں لڑکیوں کا گھر سے باہر نکلنا، کالج میں پڑھنا سب معیوب سمجھا جاتا تھا۔ شکر ہے کہ میرے ابو دیندار ہونے کے ساتھ روشن خیال بھی تھے۔ انھوں نے مجھے کبھی پردے کی بوبو نہیں بنایا۔ اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ بس مخلوط تعلیم کے ادارے میں بھیجتے وقت صرف ایک جملہ کہا تھا، ''بیٹا اصل پردہ آنکھوں کا ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ یاد رکھنا''۔ اور میں نے ان کی یہ نصیحت آنچل میں باندھ لی۔ صنف مخالف سے گفتگو کے دوران پلکوں کی چلمن ہمیشہ گری ہی رہی۔ لڑکیوں نے مذاق اڑایا تو لڑکوں نے ادا سمجھا۔

اتنی احتیاط کے باوجود ایک بار چوک ہوگئی۔ وہ ابو کا جواں سال بزنس پارٹنر تھا۔ اکثر گھر بھی آتا تھا۔ ایک شام اس کے لیے دروازہ کھولا تو بے خیالی میں بے ارادہ نظر اٹھ گئی۔

وہ عمر ہی ایسی تھی جب کھیلوں کی آنکھ مچولی کی جگہ خوابوں کی آنکھ مچولی شروع ہو جاتی ہے، جب آموں کے باغ میں بور کی بھینی بھینی مہک دل دھڑکانے لگتی ہے، جب کوئل کی کوک کا مطلب سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

نظر ملی اور جھک گئی لیکن دل میں ایک پھانس سی چبھ کے رہ گئی۔ یہ خلش کہاں ہے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا۔

وہ آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں۔ ایسی گہری جیسے گھر کے پچھواڑے بہنے والی

جھیل، ایسی شفاف جیسے شیشے کی وہ گولیاں جن سے میں بچپن میں کھیلتی تھی، ایسی گہری کہ ڈوب کر ابھرنا مشکل ہو جائے، ایسی بولتی ہوئی کہ الفاظ مات کھا جائیں۔

دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی تو میں اور زیادہ محتاط ہو گئی۔ وہ آتا تو پردے کے پیچھے چلی جاتی، پھر دل مجبور کرتا تو ذرا کی ذرا پردے کی جھری سے جھانکتی اور ان آنکھوں کو پردے کی طرف نگراں مضطرب و منتظر پاتی۔

سیاہ چمکیلی آنکھیں جیسے ستارے کوٹ کر بھرے ہوں۔ ایسی سچی کہ کوئی بھی آسانی سے دنیا کو جنت مان لے، ایسی پر خلوص جیسے اپنا سب کچھ وار دینگی۔

دل سینے کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر خون ہوتا رہا لیکن میں نے پھر نظریں نہیں اٹھائیں۔ نصیحت کا پاس و لحاظ تھا۔

پھر ایک دن سمندر پار جانے سے پہلے وہ رخصت ہونے آیا۔ میں نے پردے کی جھری سے دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایسی سرخی تھی جیسی چراغ کی لو میں ہوتی ہے، ایسی کاٹ تھی جیسی اساطیری شہزادے کے ہاتھ میں پکڑی تلوار کی دھار میں ہوتی ہے، ایسی گرمی تھی جیسی ریگستان کی تپتی ریت میں ہوتی ہے۔

میں اس کا سامنا کرنے کی جرات نہیں کر سکی اور وہ چلا گیا۔

ایک درد، ایک کرب، ایک تڑپ میری آنکھوں میں بس کے رہ گئی۔ میرے دل میں خزاں کا موسم ٹھہر گیا، میں خود سے بیگانہ ہونے لگی تو ایک دن موبائل پر پیغام آیا، ”لوگ کہتے ہیں دل دل سے بن چٹھی بن تار بات کرتا ہے لیکن میں نے تو آنکھوں کو پیامبر بنانا چاہا تھا پھر بھی نہ دل کی سنوائی ہوئی نہ آنکھوں کا وسیلہ کام آیا۔“

میں نے ٹوٹ کے گرتے ہوئے آنسوؤں کے موتیوں کی مالا بنائی اور تصور میں ان آنکھوں پر وار دی۔

دھندلائی نظروں سے لکھا،

”چلے بھی آؤ کہ۔۔۔۔۔۔ ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتی ہوں میں۔“

ڈاکٹر نعیمہ جعفری دلی سے اردو کی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ کے
ساتھ ہی ناول، ادبی مضامین، انشائیے، خاکے، سوانح اور بچوں کی
کہانیاں بھی لکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں ترجمہ نگاری سے بھی دلچسپی رکھتی
ہیں۔ آپ نے کئی انگریزی افسانوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا
ہے۔ زبان و بیان کی ندرت اور افسانوں کے بنت و بیانیے میں
موصوفہ اپنی مثال آپ ہیں۔ پہلی تحریر 'جو اماں ملی تو کہاں ملی' (افسانہ
) سن 1969 میں خاتون مشرق میں شایع ہوئی، اس کے بعد آپ کی
تخلیقات اور تحریریں ملک و بیرون کے مختلف معیاری ادبی رسائل میں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں، جن میں شاعر
، آج کل، ایوان اردو، اردو دنیا، بانو، بیسویں صدی اور چہار سو (پاکستان) قابل ذکر ہے۔ آپ کے کئی
افسانے تیلگو، کنڑ، پنجابی اور کشمیری زبان میں ترجمہ ہو کر خوب داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ کئی افسانے،
بچوں کی کہانیاں، انٹرویوز اور درجن بھر سے زائد ریڈیو ٹاک مختلف ریڈیو اسٹیشنوں، ٹی وی دوردرشن اور زی
سلام کی زینت بنے۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری کی فکر و فن پر اردو کے معروف ماہنامہ شاعر اور بیسویں صدی نے خاص
گوشے شایع کیے۔ آپ نے نظیر اکبر آبادی کے کلام کی فرہنگ بھی ترتیب دی ہے اور ماضی میں ایک ادبی رسالہ
بنام پرواز جاری کیا تھا جو مالی تنگی کے سبب مستقل طور پر جاری نہیں رہ سکا۔ آپ کی کل 18 کتابیں شایع ہو چکی
ہیں جن میں افسانوں کے چار مجموعے 'ٹوٹا ہوا آدمی'، 'مانو یا نہ مانو'، 'دھوپ کے ساتوں رنگ' اور 'حقیقت' قابل
ذکر ہیں۔ پانچواں افسانوی مجموعہ اور ایک ناول منتظر اشاعت ہے۔

پیشے سے آپ معلمہ ہیں۔ نیٹ کوالیفائی ہونے کی بنیاد پر ایک کوچنگ سینٹر کے ذریعے معاشی طور پر کمزور لڑکیوں
کو گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی سطح کی تعلیم دیتی ہیں۔

انعام و اعزاز:

دہلی اردو اکادمی نے تین کتابوں پر انعامات سے نوازا ☆ اتر پردیش اردو اکادمی نے دو کتابوں پر انعامات
تفویض کیے ☆ بہار اردو اکادمی نے کتاب پر انعام سے سرفراز کیا ☆ انڈو پاک تنظیم 'احساسات' نے ہریانہ
اردو اکادمی کے اشتراک سے 'ساہتیہ شلپی اعزاز' سے نوازا ☆ بزم مینکش کی طرف سے افسانہ نگاری میں مجموعی
خدمات کے لیے خاص اعزاز سے سرفراز کیا۔

Ek Aisa Bhi Daur
by Dr. Naima Jafri Pasha

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com

ISBN 93-93998-42-6
9789393998422

+91 9971-77-5969
www.arshiapublications.com
arshiapublicationspvt@gmail.com